سہ ماہی

صالحات

زیر سرپرستی
جاوید احمد غامدی

مدیر: نعیم احمد بلوچ

جلد: 3 شمارہ: 2 اپریل۔جون 2026ء

علم و آگہی اور شعور و تربیت

آج دنیا کے سامنے اصل سوال یہ ہے کہ اربوں ڈالر جنگی ہتھیاروں پر خرچ کیے جائیں یا انسانوں کی ترقی پر۔ اگر انھی وسائل کا ایک حصہ بھی تعلیم، معیشت اور سماجی اصلاحات پر لگایا جائے تو شاید کئی خطے مسلسل کشیدگی اور تشدد کے چکر سے نکل سکتے ہیں۔ تاریخ کا سبق واضح ہے: میزائل وقتی برتری دیتے ہیں، مگر تہذیب اور ترقی ہمیشہ علم، معاشی انصاف اور نظریاتی بیداری سے پیدا ہوتی ہے۔ قوموں کی حقیقی طاقت بارود میں نہیں بلکہ انسانوں کے شعور اور امکانات میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ سچی بات تو یہ ہے جو لوگ جنگ کو اپنی پالیسی بناتے ہیں وہ صرف یہ ثابت کر رہے ہیں کہ انھوں نے امن کی طاقت کو دریافت نہیں کیا۔

(قصہ مختصر)

www.ghamidi.org

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ

علم و آگہی اور شعور و تربیت

سہ ماہی صالحات

خواتین کے لیے

زیر سرپرستی
جاوید احمد غامدی
نگران: حسن الیاس

جلد: 3 شمارہ: 2 اپریل۔جون 2026ء

مدیر: نعیم احمد بلوچ نائب مدیر: وجیہہ حسان واحدی

مجلس ادارت

ارم نبی، بینش سلیم، ثوبیہ نورین، غزل چودھری، نکہت ستار

مجلس مشاورت

کوکب شہزاد، منیزہ ہاشمی، نسرین آفتاب، بشریٰ اعجاز، ڈاکٹر عظمیٰ عثمان

www.ghamidi.org

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ

سہ ماہی
صالحات
خواتین کے لیے

علم و آگہی اور شعور و تربیت

زیر سرپرستی
جاوید احمد غامدی

نگران: حسن الیاس

مدیر: نعیم احمد بلوچ

فہرست مضامین

1۔ اخوت کا تقاضا	استاد جاوید احمد غامدی	04
2۔ بچوں کو نماز نہ پڑھنے پر مارنا	محمد حسن الیاس	06
3۔ جنگ کے اربوں ڈالر اور نظریاتی ترقی کی طاقت	مدیر کے قلم سے	11
4۔ رُفیدہ الاسلمیؓ: دور نبوی کی پہلی معالج	وجیہہ حسان واحدی	14
5۔ شہر الصیام سے شہر الطعام تک	ثوبیہ نورین	21
6۔ رجا: جب امید بن کر نمودار ہوئی	نعیم احمد بلوچ	30
7۔ خاندانی معاملات میں ریاست کی مداخلت	فابیہ احسان	38
8۔ شادی: ایک نعمت	عائشہ کلیم	46
9۔ صبر جمیل کیا ہے؟	کلثوم ثاقب	49
10۔ امید کا روشن دان	نعیم احمد بلوچ	54
11۔ شادی: فلاح یا عدمِ تحفظ-ایک حقیقت	دانش علی/رابعہ جہانگیر	63
12۔ چھوٹے چھوٹے خداؤں کے نام	نصرت بھٹو	68
13۔ غزل	حمیرا رحمان	70
14۔ "خدا بول رہا ہے"	ڈاکٹر عرفان شہزاد	73
15۔ ڈرامہ پامال-ایک تنقیدی جائزہ	عائشہ کلیم	77

استاذ جاوید احمد غامدی

اخوت کا تقاضا

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَ لَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۚ وَ لَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَ لَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ۬ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ۚ وَ مَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۱۱﴾

ایمان والو، (اِسی اخوت کا تقاضا ہے کہ) نہ (تمھارے) مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں، ہو سکتا ہے کہ وہ اُن سے بہتر ہوں، اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، ہو سکتا ہے کہ وہ اُن سے بہتر ہوں۔ اور نہ اپنوں کو عیب لگاؤ اور نہ آپس میں ایک دوسرے کو برے القاب دو۔ (یہ سب فسق کی باتیں ہیں، اور) ایمان کے بعد تو فسق کا نام بھی بہت برا ہے۔ اور جو (اِس تنبیہ کے بعد بھی) توبہ نہ کریں تو وہی اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں۔

تسہیل و تفسیر

یاد رکھنا چاہیے کہ کسی کو معلوم نہیں ہوتا کہ ایمان و عمل کے لحاظ سے کون کس سے بہتر ہے۔ اعمال کا صحیح وزن قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی میزان عدل ہی سے معلوم ہو گا کہ کون ہلکا ہے اور کون بھاری۔ اُس میں اُن چیزوں کا سرے سے کوئی وزن نہیں ہو گا جنھیں ہم دنیا میں بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ چنانچہ یہ حسب و نسب کا غرور اور اسٹیٹس کا فخر اُس میں بالکل بے حقیقت ثابت ہو گا۔

قرآن نے یہاں مردوں کے ساتھ عورتوں کا ذکر خاص اہتمام کے ساتھ کیا ہے۔ اِس کی وجہ کیا ہے؟ مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

”۔۔۔ قرآن نے فضائل و رذائل، دونوں کے بیان میں یہ اسلوب ملحوظ رکھا ہے کہ عورتوں کا ذکر اُن مواقع میں خاص اہتمام کے ساتھ ہوا ہے، جہاں تاکید کے ساتھ اُن کو کسی فضیلت کے لیے ابھارنا یا کسی فتنے سے بچانا مقصود ہے۔ یہاں یہی دوسری صورت ہے۔ جس برائی سے یہاں مردوں کو روکا گیا ہے، وہ عورتوں کے اندر اُس سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں پائی جاتی، جتنی مردوں کے اندر پائی جاتی ہے۔ جن عورتوں کے اندر اپنی خاندانی، نسبی اور مالی برتری یا اپنے ظاہری حسن و جمال کا غرور ہوتا ہے، اُن کا انداز خطاب و کلام اُن عورتوں کے ساتھ حقارت آمیز ہوتا ہے جن کو وہ اپنے مقابل میں فروتر خیال کرتی ہیں۔“(تدبر قرآن ۷/ ۵۰۵)

"لمز" کے معنی طعن کرنے اور آنکھوں سے اشارہ کرتے ہوئے کسی پر کوئی طنزیہ فقرہ چست کر دینے کے ہیں۔ اِس قسم کے زہر آلود فقرے کہنے والے کے حسد اور اُس کے فخر و غرور کا اظہار کرتے ہیں جس سے دوسروں کی حوصلہ شکنی ہوتی اور باہمی تعلقات میں ایسا بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے جو بارہا نفرت اور دشمنی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ قرآن نے توجہ دلا دی ہے کہ جو لوگ اپنے کسی بھائی کو طعن کا نشانہ بناتے ہیں، وہ گویا اپنے ہی سینے کو اپنے تیر کا نشانہ بناتے اور اپنے ہی کو مجروح کرتے ہیں۔

برالقب دینا کوئی معمولی برائی نہیں ہے۔ یہ طریقہ عام طور پر کسی فرد یا قوم کی انتہائی تذلیل کے لیے اختیار کیا جاتا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اِس طرح کے القاب آسانی سے زبانوں پر چڑھ جاتے اور نہایت پایدار اور دوررس نتائج پیدا کرتے ہیں۔ چنانچہ اِن کی پیدا کی ہوئی تلخیاں پشت ہا پشت تک باقی رہتی ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ افراد میں خیر خواہی کا رشتہ ختم ہو جاتا اور قومی وحدت پارہ پارہ ہو جاتی ہے۔

اسی طرح انفرادی طور پر بھی یہ فعل انتہائی فساد اور نفرت کا باعث بنتا ہے۔ یہاں ہر وہ لقب، نام یا ناپسندیدہ نام مراد ہے جو پکارنے والے کو ناپسند ہے۔ چاہے یہ ایسے جسمانی عیب ہی پر مشتمل کیوں نہ ہو جو کسی شخص میں موجود ہو۔ یعنی کسی فربہ خاتون کو اس کے فربہ ہونے کے باوجود اگر ہم کوئی نام دیں گے تو یہ اللہ کے اس حکم کی خلاف ورزی ہو گی۔

تسہیل: نعیم احمد بلوچ

محمد حسن الیاس

بچوں کو نماز نہ پڑھنے پر مارنا

(ایک روایت سے استدلال)

حدیث کی بعض کتابوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے یہ بات نقل ہوئی ہے کہ بچے اگر دس سال کی عمر تک نماز ادا نہ کریں تو اُنھیں مارا جائے گا، یہاں تک کہ وہ نماز ادا کرنا شروع کر دیں۔ اِس مضمون کی روایت کے الفاظ کچھ یوں ہیں:

عن عمرو بن شعيب، عن أبيه، عن جده، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ''مروا أولادكم بالصلاة وهم أبناء سبع سنين، واضربوهم عليها وهم أبناء عشر سنين، وفرقوا بينهم في المضاجع''. (سنن ابو داؤد، رقم ۴۹۵)

''عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تمھاری اولاد سات سال کی ہو جائے تو تم ان کو نماز پڑھنے کا حکم دو، اور جب وہ دس سال کے ہو جائیں تو نماز نہ پڑھنے پر انھیں مارو، اور ان کے سونے کے بستر الگ کر دو۔''

اِس مضمون میں ہم اِس روایت کو محدثین کے قائم کردہ سند کے معیارات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

ذخیرۂ حدیث میں یہ روایت صرف دو صحابہ سے منقول ہے:

۱۔ سبرہ بن معبد الجہنی۔

۲۔ عبد اللہ بن عمرو۔

پہلے صحابی، سبرہ بن معبد الجہنی سے اِس ضمن میں جو بھی روایات نقل ہوئی ہیں، محدثین کے نزدیک وہ سب کی سب ''ضعیف'' ہیں۔ اِن روایات کے ضعف کی بنیادی وجہ ایک راوی ''الربیع الجہنی'' ہیں۔ علماے حدیث اس روایت پر جو حکم لگاتے ہیں، وہ یہ ہے:

'إسناد ضعيف، فيه عبد الملك بن الربيع الجهني وهو ضعيف الحديث'.

اِس سلسلے کی روایات مسند احمد، ابو داؤد اور سنن ترمذی وغیرہ میں نقل ہوئی ہیں۔

اِس کے بعد دوسرے صحابی عبد اللہ بن عمرو ہیں۔ اُن کی نسبت سے یہ روایت سب سے پہلے ''المدونۃ الکبریٰ''، امام مالک میں نقل ہوئی ہے۔ اس روایت کے الفاظ ہیں:

وقال مالك: تؤمر الصبيان بالصلاة إذا أثغروا. قال سحنون، عن ابن وهب، عن عبد الله بن عمرو بن العاص، وسبرة الجهني أن رسول الله ﷺ قال: ''مروا الصبيان بالصلاة لسبع سنين، واضربوهم عليها لعشر سنين، وفرقوا بينهم في المضاجع"

''مالک کہتے ہیں: بچوں کے جب دودھ کے دانت گر جائیں تو انھیں نماز کا حکم دیں، سحنون ابن وھب سے اور وہ عبد اللہ بن عمرو بن عاص اور سبرہ الجہنی سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تمھاری اولاد سات سال کی ہو جائے تو تم ان کو نماز پڑھنے کا حکم دو، اور جب وہ دس سال کے ہو جائیں تو نماز نہ پڑھنے پر انھیں مارو، اور ان کے سونے کے بستر الگ کر دو''۔

یہاں اس روایت میں دونوں صحابہ کا ایک ساتھ ذکر کیا گیا ہے، گویا واقعہ ایک ہی ہے۔ لیکن اِس روایت میں مسئلہ یہ ہے کہ اِسے ایک راوی ''ابن وھب'' بیان کر رہے ہیں جن کی پیدایش ہی ۱۲۵ھ کی ہے، جب کہ جن صحابہ سے وہ نقل کر رہے ہیں، اُن دونوں کا انتقال ۶۵ھ سے پہلے ہو چکا تھا۔

گویا یہ بھی ایک منقطع روایت ہے اور سند کے لحاظ سے نا قابل قبول ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام مالک نے اِس روایت کے علم میں ہونے کے باوجود خود بھی اسے اپنی ''موطا'' کا حصہ نہیں بنایا۔

اِس کے بعد عبد اللہ بن عمرو سے سب سے پہلے یہ روایت حدیث کی جس کتاب میں سامنے آئی، وہ ''مصنف ابن ابی شیبہ'' ہے۔ اس روایت کے الفاظ یوں ہیں:

عن داود بن سوار، عن عمرو بن شعيب، عن أبيه، عن جده، قال: قال نبي الله ﷺ: ''مروا صبيانكم بالصلاة إذا بلغوا سبعا واضربوهم عليها إذا بلغوا عشرا وفرقوا بينهم في المضاجع''. (رقم ۴۳۹۴)

داؤد بن سوار عمرو بن شعیب سے، وہ والد سے اور وہ دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جب تمھاری اولاد سات سال کی ہو جائے تو تم ان کو نماز پڑھنے کا حکم دو، اور جب وہ دس سال کے ہو جائیں تو نماز نہ پڑھنے پر انھیں مارو، اور ان کے سونے کے بستر الگ کر دو۔''

دراصل روایت کا یہی وہ سلسلۂ سند ہے جسے بعد کی کتابوں میں بھی اپنایا گیا اور بعض علما نے اسے ''حسن لغیرہ'' قرار دے کر قبول کر لیا اور یوں یہ حدیث بہت شہرت پا گئی۔ اور اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب ایک قابل اطمینان بات تصور کر لیا گیا۔ علما بالعموم اس روایت کا یہ حکم بیان کرتے ہیں:

إسناده حسن في المتابعات والشواهد رجاله ثقات وصدوقيين عدا سوار بن داود المزني.

ہماری رائے میں اس سلسلے کی روایات پر دقت نظر سے غور کیا جائے تو سند کے معیارات کی روشنی میں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں:

پہلا یہ کہ ان تمام روایات میں 'سوار بن داود' موجود ہیں جن کے بارے میں متعدد علماے جرح وتعدیل مطمئن نہیں ہیں۔ مثلاً حافظ ذہبی نے ان پر ''ضعف'' کا حکم لگایا ہے۔ اسی طرح ''تقریب التہذیب'' کے مصنف کی رائے میں بھی قابل اعتماد نہیں ہیں۔ ان کے بقول:

'ضعيف يعتبر به، ولم يحسن الرأي فيه سوى أحمد'.

لہٰذا تنہا صرف اسی ایک راوی کی بنا پر عبد اللہ بن عمرو سے مروی اس سلسلے کی تمام روایات ''ضعیف'' قرار دی جا سکتی ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ بہت سے معاصر علماے حدیث نے بھی اس روایت کو سنداً قبول نہیں کیا۔

دوسرا سوال اس سلسلے کی روایات میں یہ اٹھتا ہے کہ ''عمرو بن شعیب'' اپنے والد کی نسبت سے خود اپنے ہی دادا سے روایت کر رہے ہیں یا اُن کے والد اپنے دادا سے روایت کر رہے ہیں (عن عمرو بن شعیب، عن أبیہ، عن جدہ)، روایت میں اس کی کوئی صراحت نقل نہیں ہوئی۔ چنانچہ اگر پہلی صورت ہے تو روایت میں ارسال ہو گا اور دوسری ہے تو انقطاع ہو گا۔

تیسری بات یہ کہ خود ''مصنف ابن ابی شیبہ''، جہاں یہ روایت سب سے پہلے نقل ہوئی، وہیں ابن ابی شیبہ نے اِس پوری بات کو ایک تابعی کے قول کے طور پر الگ سے بھی نقل کیا ہے، جس سے اِس بات کو تقویت ملتی ہے کہ یہ سرے سے حدیث تھی ہی نہیں، بلکہ ایک تابعی کا قول تھا ـــــ چنانچہ ''مصنف'' ہی میں ہے:

حدثنا وكيع، عن سفيان، عن أبي رجاء، عن مكحول، قال: ''يؤمر الصبي بها إذا بلغ السبع ويضرب عليها إذا بلغ عشرا''. (رقم ۳۴۰۲)

''وکیع کہتے ہیں کہ سفیان نے ابی رجا سے اور انھوں نے مکحول سے سنا کہ جب تمھاری اولاد سات سال کی ہو جائے تو تم ان کو نماز پڑھنے کا حکم دو، اور جب وہ دس سال کے ہو جائیں تو نماز نہ پڑھنے پر انھیں مارو۔"

لہٰذا سند میں ضعف اور درجہ بالا علل، دونوں ہی کی بنا پر یہ روایت قابل قبول نہیں ہو سکتی۔

یہ غالباً کسی صحابی کا اثر یا تابعی کی اجتہادی رائے تھی، جو ایسے نقل ہو گئی ہے۔ اِس بات کی تائید ''مسند بزار'' کی ایک اور روایت سے بھی ہوتی ہے، علم حدیث کے ایک بڑے عالم امام شوکانی نے اپنی کتاب ''نیل الاوطار'' میں بھی اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے اور بتایا کہ ایک دوسری روایت میں صراحت ہے کہ یہ پوری روایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ایک کاغذ پر لکھی ہوئی ملی تھی جس میں رسول اللہ کی نسبت کے بغیر ہی کسی شخص کے الفاظ لکھے تھے کہ اس کے بقول غالباً نو سال کی عمر میں مارا جا سکتا ہے۔

روایت یہ ہے:

عن عبيد الله بن أبي رافع، عن أبيه رضي الله عنه، قال: وجدنا صحيفة في قراب سيف رسول الله ﷺ بعد وفاته فيها مكتوب: ''بسم الله الرحمٰن الرحيم، فرقوا بين مضاجع الإخوة والأخوات لسبعِ سنين، واضربوا أبناءكم على الصلاة إذا بلغوا أظنه تسعا''. (رقم ۳۳۳۲)

عبید اللہ بن ابی رافع اپنے والد سے بیان کرتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ کی وفات کے بعد تلوار کے پاس ایک کاغذ لکھا ملا تھا جس پر لکھا تھا: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، بہن بھائیوں کے بستر سات سال کی عمر میں الگ کر دو اور بچوں کو میرے خیال کے مطابق نو سال کی عمر میں نماز ادا نہ کرنے پر مارو۔

خلاصہ

اِس روایت کو قبول کر کے بعض علما نماز نہ پڑھنے پر مارنے کو محض تربیتی تادیباً کے معنی میں مراد لیتے ہیں، لیکن ہماری طالب علمانہ رائے میں اس روایت کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہوتی اور یہ ایک ''ضعیف'' روایت ہے۔

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ بخاری اور مسلم تک نے اپنے انتخاب میں اس حدیث کو قبول نہیں کیا۔

اس روایت کی سند پر کلام کے ساتھ ساتھ یہ روایت علم و عقل کے مسلمات اور دین کے مجموعی مزاج سے بھی بظاہر متصادم نظر آتی ہے۔ جب شریعت میں نماز کا مکلف ہی بالغ فرد ہے تو دس سال کی عمر میں نماز ادا نہ کرنے پر مارنا ناقابل فہم ہے۔ اِس کے ساتھ ساتھ نفسیات کے ماہرین بھی یہ بتا سکتے ہیں کہ بچپن کی یہ سختی کیسے انسانوں کے مزاج اور مذہب سے تعلق پر اثر انداز ہوتی ہے، جب کہ دوسری جانب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسی کریم النفس شخصیت، جنھوں نے پوری زندگی دین کو نرمی، ملائمت اور استدلال سے سمجھایا، وہ کیسے علی الاطلاق ایسی ہدایت کر سکتے ہیں جو جسمانی مار، نفسیاتی دباؤ اور عبادت جیسے شعوری عمل کو زبردستی ادا کرانے کی ترغیب بن جائے۔ واللہ اعلم۔

قصہ مختصر

نعیم احمد بلوچ

جنگ کے اربوں ڈالر اور نظریاتی ترقی کی طاقت

دنیا کی سیاست میں ایک سوال بار بار سر اٹھاتا ہے: کیا قوموں کو بدلنے کے لیے بم اور میزائل زیادہ مؤثر ہوتے ہیں یا تعلیم، معاشی ترقی اور فکری تبدیلی؟ جدید تاریخ کے تجربات اس سوال کا جواب بڑی حد تک واضح کر دیتے ہیں۔ جنگیں وقتی نتائج تو پیدا کر سکتی ہیں، مگر پائیدار تبدیلی ہمیشہ نظریاتی اور سماجی ارتقا سے آتی ہے۔

حالیہ جنگی اخراجات کے اعداد و شمار کو دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ چند دنوں میں ہی اربوں ڈالر کے ہتھیار استعمال ہو جاتے ہیں۔ ایک خبر کے مطابق صرف دو دنوں میں تقریباً 5.6 ارب ڈالر کے جنگی وسائل استعمال ہوئے۔ یہ رقم چند گھنٹوں میں بارود اور دھماکوں کی صورت میں ختم ہو جاتی ہے۔ مگر اگر یہی سرمایہ تعلیم، صحت، معاشی ڈھانچے اور سماجی اصلاحات پر لگایا جائے تو یہ کئی نسلوں کی تقدیر بدل سکتا ہے۔

اسلامی فکر بھی اس حقیقت کی طرف توجہ دلاتی ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کے ایک ارشاد کا مفہوم یہ بیان کیا جاتا ہے کہ غربت اور محتاجی انسان کے کردار کو کمزور کر دیتی ہے اور بتدریج اخلاقی بنیادوں کو بھی ختم کر سکتی ہے۔ اس حکمت کو اگر اجتماعی سطح پر دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ جب معاشروں میں محرومی، ناانصافی اور معاشی جمود بڑھتا ہے تو شدت پسندی اور انتہا پسندانہ نظریات کو پنپنے کا موقع ملتا ہے۔

افغانستان کی حالیہ تاریخ اس کی ایک نمایاں مثال ہے۔ دو دہائیوں تک جاری رہنے والی جنگ میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے کھربوں ڈالر خرچ کیے۔ جدید اسلحہ، فوجی طاقت اور بڑے آپریشن کیے گئے۔ انفراسٹرکچر کے متعدد منصوبے بھی مکمل ہوئے مگر معاشرے کی گہری نظریاتی ساخت میں بنیادی تبدیلی پیدا نہ ہو سکی۔ جب بیرونی فوجی موجودگی ختم ہوئی تو وہی پرانے نظریاتی ڈھانچے طالبان کی شکل میں دوبارہ غالب آ گئے۔ یہ تجربہ اس بات کی یاد دہانی

ہے کہ صرف عسکری طاقت کسی معاشرے کے فکری رخ کو مستقل طور پر تبدیل نہیں کر سکتی۔

ایران کے حوالے سے بھی یہی سوال اٹھتا ہے کہ اگر عالمی طاقتیں صرف فوجی دباؤ کے بجائے معاشی ترقی، تعلیم اور فکری مکالمے کے ذریعے سے معاشرے میں تبدیلی کی حکمت عملی اپناتیں تو شاید نتائج مختلف ہوتے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ معاشروں میں حقیقی تبدیلی اس وقت آتی ہے جب عوام کے اندر شعور، تعلیم اور معاشی استحکام پیدا ہو۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ ایران میں مذہبی تنگ نظری کی وجہ سے یہ ممکن نہیں تھا۔ لیکن اس کی بھی ایک تاریخ ہے۔ اس مذہبی شدت پسندی کو ہمیشہ عسکری بالادستی سے ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ مگر نتیجہ وہی کہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دعا کی! کیا ہم نے کبھی غور کیا کہ اس مذہبی انتہا پسندی کو تخریب کے بجائے کبھی تعمیر سے بدلنے کی کوشش کی گئی؟ دشمنی، نفرت اور عسکریت سے کبھی بھی نظریات نہیں بدلتے۔

تاریخ میں اس کی کئی مثبت مثالیں موجود ہیں۔ تاتاریوں کی مثال لیجیے۔ ایک زمانہ تھا جب تاتاری دنیا کے لیے خوف اور تباہی کی علامت سمجھے جاتے تھے۔ ان کی یلغار نے ایشیا اور یورپ کے کئی علاقوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اپنے وقت کی سپر پاور مسلم حکومت کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ مگر وقت کے ساتھ جب ان اقوام نے علم، مذہب اور تہذیبی اثرات کو قبول کیا تو ان کے معاشرتی کردار میں نمایاں تبدیلی آئی۔ کئی علاقوں میں وہی قومیں بعد میں ریاستی نظم، ثقافت اور علم کی سرپرست بن گئیں۔ اس تبدیلی کا بنیادی سبب صرف طاقت نہیں بلکہ فکری اور تہذیبی ارتقا تھا۔

امریکہ کی تاریخ میں بھی ایسے کئی تجربات ملتے ہیں۔ مقامی قبائل، جنہیں عموماً ریڈ انڈین کہا جاتا ہے، ایک طویل اور پیچیدہ تاریخی عمل سے گزرے۔ ابتدا میں تصادم اور تنازع کی تاریخ رہی، مگر وقت کے ساتھ ساتھ تعلیم، شہری حقوق اور سماجی اداروں کی توسیع نے ان کمیونٹیز کو جدید معاشرے کے اندر اپنی شناخت کے ساتھ آگے بڑھنے کے مواقع فراہم کیے۔ یہ عمل آسان نہیں تھا، مگر اس نے یہ ضرور ثابت کیا کہ سماجی شمولیت اور ترقی کے مواقع کسی بھی کمیونٹی کی سمت بدل سکتے ہیں۔

اسی طرح امریکہ میں افریقی نژاد آبادی کی مثال بھی ایک اہم تاریخی سبق فراہم کرتی ہے۔ غلامی کے دور سے لے کر شہری حقوق کی تحریک تک ایک طویل جدوجہد جاری رہی۔ مگر جب تعلیم، قانونی حقوق اور معاشی مواقع میں اضافہ ہوا تو اس کمیونٹی کے اندر سے دانشور، سائنس دان، سیاست دان اور عالمی سطح کے رہنما سامنے آئے۔ آج وہی کمیونٹی امریکی معاشرے کا ایک فعال اور بااثر حصہ ہے۔ یہ تبدیلی کسی فوجی مہم کا نتیجہ نہیں بلکہ طویل سماجی اور نظریاتی ارتقا کا ثمر ہے۔

یہ تمام مثالیں ایک بنیادی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں: قوموں کی فکری سمت کو بدلنے کے لیے بندوق سے زیادہ طاقتور چیز تعلیم، معاشی انصاف اور سماجی مواقع ہوتے ہیں۔ جب لوگوں کو بہتر زندگی کا راستہ دکھائی دیتا ہے تو وہ خود شدت پسندی اور جمود سے دور ہونے لگتے ہیں۔

اسی لیے آج دنیا کے سامنے اصل سوال یہ ہے کہ اربوں ڈالر جنگی ہتھیاروں پر خرچ کیے جائیں یا انسانوں کی ترقی پر۔ اگر انہی وسائل کا ایک حصہ بھی تعلیم، معیشت اور سماجی اصلاحات پر لگایا جائے تو شاید کئی خطے مسلسل کشیدگی اور تشدد کے چکر سے نکل سکتے ہیں۔

تاریخ کا سبق واضح ہے: میزائل وقتی برتری دیتے ہیں، مگر تہذیب اور ترقی ہمیشہ علم، معاشی انصاف اور نظریاتی بیداری سے پیدا ہوتی ہے۔ قوموں کی حقیقی طاقت بارود میں نہیں بلکہ انسانوں کے شعور اور امکانات میں پوشیدہ ہوتی ہے۔

سچی بات تو یہ ہے جو لوگ جنگ کو اپنی پالیسی بناتے ہیں وہ صرف یہ ثابت کر رہے ہیں کہ انھوں نے امن کی طاقت کو دریافت نہیں کیا۔

وجیہہ حسان واحدی

رُفیدہ الاسلمیؓ: دورِ نبوی کی پہلی معالج

ایک ایسی خاتون کا ذکر، جنھوں نے مدینہ کی نوزائیدہ ریاست میں خدمت اور مہارت کی وہ داستان رقم کی جس نے انھیں دوسری سینکڑوں صحابیات سے ممتاز کر دیا۔ انھیں یہ اعزاز حاصل ہوا کہ ان کا شمار اسلامی معاشرے کی پہلی نرس اور معالجہ کے طور پر کیا جائے۔

یہ مدینہ کی ایک پریشان دوپہر تھی۔ ہوا میں کھجور کے درختوں کی ہلکی سی سرسراہٹ گھلی ہوئی تھی، فضا ایک عجیب سی بے چینی سے بھرپور۔ اچانک خبر پھیلی کہ میدانِ جنگ سے زخمی مجاہدین واپس لائے جا رہے ہیں۔ لوگ گھبراہٹ میں اِدھر اُدھر دوڑنے لگے، مگر ایک خاتون تھیں جو اس ہنگامے میں بھی غیر معمولی سکون کے ساتھ اپنے خیمے کی تیاری میں مصروف تھیں۔ ان کے ہاتھ تیزی سے پٹیاں باندھ رہے تھے، آنکھوں میں عزم کی چمک تھی، اور دل میں صرف ایک ہی جذبہ — خدمتِ انسانیت۔

یہ تھیں رُفیدہ الاسلمیہؓ — وہ نام جو تاریخ کے اوراق میں ہمدردی، ہمت اور قیادت کی روشن مثال بن کر ہمیشہ کے لیے ثبت ہو گیا۔

کہاں ہم پندرہ سو برس پہلے کے زمانے کے بارے میں یہ سوچتے ہیں کہ اس وقت خواتین سوائے مرد کے حکم پر چلنے کے علاوہ اور کیا کرتی ہوں گی۔۔ اور کہاں ہم رُفیدہؓ جیسی شخصیت کے بارے میں یہ جان رہے ہیں!

جب یہ دل دہلا دینے والی خبر پہنچی کہ احد کے میدان میں مسلمانوں کو شکست ہو گئی ہے اور مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد زخمی ہے۔

رُفیدہ بطور معالجہ، زخمیوں اور بیماروں کی تیمارداری سے بڑھ کر ان کی خدمت کرنے کے لیئے وہاں موجود تھیں۔

ابتدائی زندگی اور تعارف

رُفیدہؓ کا تعلق مدینہ کے قبیلہ بنو اسلم سے تھا۔ ان کے والد سعد الاسلمی ایک ماہر طبیب تھے۔ وہ ان انصاری صحابہ میں سے تھے جو حضور کی آمد پر یا اس سے پہلے ہی ایمان لا چکے تھے۔ انہی سے رُفیدہؓ نے طِبّ کے بنیادی اصول سیکھے۔ مگر یہ صرف علم نہیں تھا جو انہیں منفرد بناتا تھا، بلکہ انسانوں کے درد کو محسوس کرنے کی غیر معمولی صلاحیت تھی۔

وہ صرف ایک طبیبہ نہیں تھیں، بلکہ ایک ایسی ہمدرد شخصیت تھیں جو بیماروں کے ساتھ بیٹھ کر ان کے زخم ہی نہیں، ان کے دل بھی سنبھالتی تھیں۔

بی بی سی کے مقالہ نگار وقار مصطفیٰ کی مستند تاریخی رپورٹ سے اخذ ہے کہ قبیلہ خزرج کی شاخ بنی اسلم سے تعلق رکھنے والی رُفیدہ کی پیدائش تقریباً 597 عیسوی میں یثرب کے شہر میں ہوئی۔ بعد میں یثرب ہی مدینۃ النبی یا مدینہ کے نام سے معروف ہوا جب پیغمبر اسلام نے وہاں مکہ سے ہجرت کی۔

وقار مزید لکھتے ہیں:

'اپیریزنگ رُفیدہ الاَسلمیہ، فرسٹ مسلم نرس اینڈ پائنیر آف اسلامک لرننگ' کے عنوان تلے کی گئی اس تحقیق سے پتا چلتا ہے کہ ایک طبیب اور جراح سعد الاسلمی کی بیٹی رُفیدہ نے اپنے والد کی معاون کے طور پر طِب یعنی میڈیسن اور جراحی یعنی سرجری میں عملی مہارتیں حاصل کی تھیں۔ ان کی نرسنگ کی خدمات کا آغاز عہدِ نبوی میں تقریباً 620 عیسوی میں اس وقت ہوا جب ان کی عمر تقریباً ۲۳ سے ۲۵ سال کے درمیان تھی۔'

پہلا "فیلڈ ہسپتال" ایک انقلابی قدم

مدینہ میں مسجدِ نبویؐ کے قریب رُفیدہؓ نے ایک خیمہ قائم کیا جو دراصل اسلامی تاریخ کا پہلا باقاعدہ "فیلڈ ہسپتال" تھا۔ یہاں زخمیوں کا علاج کیا جاتا، ان کی دیکھ بھال ہوتی، اور انہیں آرام فراہم کیا جاتا۔ یہ خیمہ صرف ایک علاج گاہ نہیں تھا، بلکہ ایک ایسی جگہ تھی جہاں امید زندہ رہتی تھی۔

یہ خیمہ اصل میں مہاجرین کی مدد کے لیے لگایا گیا تھا۔ اسے صفہ یعنی چبوترہ بھی کہتے ہیں۔ کئی جگہ اسے 'خیمۂ رفیدہ' بھی کہا جاتا تھا۔ یہ ہسپتال مدینہ میں اس مقام کے قریب قائم کیا گیا تھا جہاں آج صحابی سلمان فارسی کے نام سے منسوب مسجد واقع ہے۔

یہ ہسپتال مدینہ میں اس مقام کے قریب قائم کیا گیا تھا جہاں آج صحابی سلمان فارسی کے نام سے منسوب مسجد واقع ہے

مکہ کے کفار سے جان اور ایمان بچا کر مدینہ کی طرف ہجرت کرنے والوں کو اللہ کے رسول نے مواخات کے رشتے میں باندھ دیا تھا۔ مختلف روایات میں ان کی تعداد ۴۵ بیان کی جاتی ہے۔ اس میں وت کے لحاظ سے اضافہ اور کمی بھی ہوتی رہتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود جو مہاجر بچ گئے ان کی تعداد مختلف اوقات میں مختلف رہی۔ یہ چالیس سے تین سو افراد تک بھی بیان کی جاتی ہے۔ جب اتنے لوگ اس طرح کے کیمپ میں رہنے لگیں اور ان میں عورتیں، بچے اور بیمار بھی ہوں، تو ظاہر ہے ان کی نگہداشت کی سخت ضرورت تھی۔ سیدہ رُفیدہ نے اس کیمپ میں قیام پذیر لوگوں کے لیے یہ خدمت سرانجام دی۔

رُفیدہ الاسلمیہ کے اس خیمے کا ذکر ابن عبدالبر نے 'الاستیعاب' میں، ابن الاثیر نے 'اسد الغابہ' میں اور ابنِ حجر نے 'الاصابہ' میں کیا ہے۔ ابنِ سعد نے 'الطبقات' میں ایک ملتے جلتے نام سے ایک خیمے کا ذکر کیا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ اس سے مراد رفیدہ ہی کا خیمہ ہے۔

یہ سچ اس روایتی تصور سے بالکل برعکس تصویر پیش کرتا ہے جو عام طور پر خواتین کے حوالے سے اسلام کے نام پر پیش کی جاتی ہے کہ اس وقت خواتین بس معاشرے پر ایک بوجھ تھیں اور وہ صرف اور صرف گھروں تک ہی محدود تھیں۔

’تاریخ البیمارستانات فی الاِسلام‘ کے مصنف احمد عیسیٰ کے مطابق رُفیدہ کا یہ طبی خیمہ اسلام کا پہلا ’بیمارستانات‘ یا ایسا موبائل کیئر یونٹ تھا، جسے ایک جگہ سے دوسری جگہ وقتِ ضرورت منتقل کیا جاسکتا تھا۔

احمد سعید کے مطابق خیمے میں پٹیاں، دوائیں، جڑی بوٹیاں اور روئی موجود ہوتی تھی تاکہ بیماروں اور زخمیوں کا علاج کیا جاسکے۔ رُفیدہ خود ان مریضوں کی خدمت کی ذمہ داری اٹھاتیں جو محتاج اور ضرورت مند ہوتے تھے۔

رُفیدہ کی طبی خدمات میں ابتدائی طبی امداد، ہنگامی علاج، شدید زخمیوں کی دیکھ بھال، میدانِ جنگ میں زخمیوں کو الگ خیموں میں قرنطینہ کرنا، بحالی اور طویل مدتی نگہداشت شامل تھی۔ صفائی اور حفظانِ صحت کا خیال رکھتے ہوئے مریضوں کے لیے مزید ایسے ہوادار خیمے قائم کیے جاتے تھے جہاں انھیں سخت صحرائی موسم سے سایہ میسر آتا تھا اور صاف پینے کا پانی ملتا تھا۔

پہلا نرسنگ اسکول

اپنی اس مہارت سے رُفیدہ الاسلمیہ ایک بااختیار اور دور اندیش خاتون کے طور پر ممتاز ہوئیں۔ انھوں نے دیگر خواتین کو بھی بااختیار بنایا اور انھیں رضاکار نرسوں کے طور پر تربیت دی۔

’اپیریزنگ رُفیدہ الاَسلمیہ‘ کے عنوان سے کی گئی تحقیق کے مطابق رُفیدہ الاسلمیہ نے اپنے والد کے ساتھ کام کرتے ہوئے جو تجربہ حاصل کیا، اس کی بنیاد پر انھوں نے رضاکار خواتین کے لیے ایک عملی طبی تربیتی پروگرام شروع کیا، جس میں مریضوں کی دیکھ بھال کے طریقے سکھائے جاتے تھے۔ وہ دوسری صحابیات میں بھی اعتماد پیدا کرتیں اور انھیں نرسنگ کی ضروری مہارتیں سکھاتیں۔ انھوں نے اپنی ساتھی خواتین کے لیے درکار مادی وسائل منظم طریقے سے مہیا کیے تاکہ مریضوں کی دیکھ بھال مؤثر انداز میں کی جاسکے۔ تحقیق کے مطابق یہی تربیتی عمل بعد میں ارتقا پاتے ہوئے پہلے باقاعدہ نرسنگ مدرسے کی صورت اختیار کر گیا۔

’رُفیدہ الاسلمیہ نے 622 عیسوی میں پہلا باقاعدہ نرسنگ مدرسہ قائم کیا۔ اس ادارے میں پیغمبرِ اسلام کی بعض ازواج اور آپ کی صحابیات کو نرسنگ کی تربیت دی جاتی تھی تاکہ اسلامی جنگوں (623–630 عیسوی) کے دوران وہ آپ اور مسلم فوج کی مدد کر سکیں۔

’رُفیدہ الاسلمیہ اپنی مؤثر گفتگو اور ابلاغ کی صلاحیت کے لیے بھی مشہور تھیں۔ یہ مہارت انھوں نے اس وقت حاصل کی جب وہ اپنے والد کے ساتھ بطور طبی معاون مریضوں کے علاج میں شریک ہوتی تھیں۔ اس تجربے نے انھیں مریض اور نظام دونوں پر مرکوز ایک متوازن اندازِ عمل اختیار کرنے میں مدد دی۔

تحقیق بتاتی ہے کہ وہ علاج کے بعد مریضوں کی حالت کے جائزے اور مسلسل نگرانی پر بھی زور دیتی تھیں تاکہ علاج درست طریقے سے جاری رہے اور مریض جلد صحت یاب ہو سکیں۔

'ان کی مؤثر ابلاغی صلاحیت احترام، دیانت، سچائی اور خلوص جیسے اوصاف سے نمایاں تھی۔ اسی بنیاد پر رُفیدہ الاسلمیہ نے نرسنگ اخلاقیات کا ابتدائی ضابطہ بھی وضع کیا، جس کے ذریعے انھوں نے رضاکار نرسوں کے لیے پیشہ ورانہ طرزِ عمل کے اصول متعین کیے۔'

'پیغمبرِ اسلام کی اجازت سے یہ خواتین جنگوں میں لشکر کے پچھلے حصے میں زخمی سپاہیوں کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔'

روایت کے مطابق پیغمبرِ اسلام رُفیدہ کی مؤثر طبی خدمات سے اتنے متاثر ہوئے کہ بعض زخمی صحابہ کو براہِ راست ان کے پاس بھیجنے کی ہدایت کرتے تھے، خصوصاً بدر، احد، خندق اور خیبر کی جنگوں کے مواقع پر۔

میدانِ جنگ میں ایک بہادر خاتون

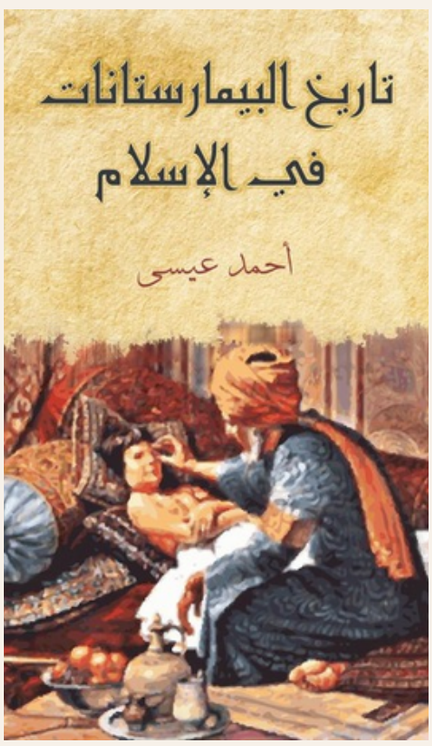

غزوۂ خندق جیسے اہم معرکے پیش آئے، تو رُفیدہؓ نے صرف پیچھے رہ کر خدمت نہیں کی—وہ خود میدانِ جنگ میں پہنچیں۔ انہوں نے خواتین کی ایک ٹیم تیار کی جو زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی، پانی فراہم کرتی، اور شدید زخمیوں کو محفوظ مقام تک منتقل کرتی۔ ان کی قیادت میں یہ ٹیم نہ صرف طبی امداد فراہم کرتی بلکہ نظم و ضبط اور پیشہ ورانہ اخلاقیات کی بھی مثال قائم کرتی۔

صحیح بخاری کی کتاب 'الادب المفرد' میں اور ابن سعد نے 'الطبقات' میں محمود بن لبید کی روایت نقل کی ہے کہ جب سعد بن معاذ کی بازو کی رگ غزوۂ خندق کے دن زخمی ہوئی اور زخم شدید ہو گیا تو انھیں ایک خاتون کے پاس منتقل کیا گیا جنھیں رُفیدہ کہا جاتا تھا اور وہ زخمیوں کا علاج کرتی تھیں۔

رسول اللہ ان کی عیادت کے لیے تشریف لاتے، ان کا حال پوچھتے اور سعد انھیں اپنی حالت بتاتے تھے۔

روایت ہے کہ پیغمبرِ اسلام رُفیدہ اور انصار کی نرسوں کی فراہم کردہ طبی خدمات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے انھیں مالِ غنیمت میں وہی حصہ عطا کیا جو اگلی صفوں میں لڑنے والے سپاہیوں کو دیا جاتا تھا۔ اس کا ذکر مشہور مورخ

واقدی اور ابن عبد البر نے کیا ہے۔

زمانہ امن میں خدمات

تحقیق سے علم ہوتا ہے کہ اسی طرح امن کے زمانے میں رُفیدہ الاسلمیہ نے کم عمر لڑکیوں اور خواتین کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی اور بیماریوں سے متعلق سماجی مسائل کے حل میں بھی نہایت مفید ثابت ہوئیں۔

’وہ خاص طور پر ضرورت مند بچوں، یتیموں، معذور افراد اور غریب لوگوں کی کمیونٹی سطح پر دیکھ بھال کرتی تھیں۔ یہ عمل نبی کی اس ہدایت کے مطابق تھا، جس میں خواتین کی مسلسل تعلیم کو فروغ دینے کی تاکید کی گئی تھی۔ بعد ازاں وہ ان ہی تربیت یافتہ خواتین کو نرسوں کے طور پر شامل کرتی تھیں۔‘

محقق وقار مصطفیٰ بیان کرتے ہیں کہ محمد نہال کی تحقیق ہے کہ رُفیدہ الاسلمیہ نے دنیا کے پہلے پالی ایٹو کیئر نظام کو بھی منظم کیا۔ عالمی ادارۂ صحت کے مطابق پالی ایٹو کیئر سے مراد ایسا طریقہ ہے جو جان لیوا بیماریوں سے متاثر مریضوں اور ان کے خاندانوں کی زندگی کے معیار کو بہتر بناتا ہے۔ غوث سیوانی نے لکھا ہے کہ رُفَیْدَہ الاسلمیہ تاریخ اسلام میں پہلی خاتون ڈاکٹر، نرس اور سرجن کے طور پر جانی جاتی ہیں۔ انھوں نے اپنی جائیداد کو طبی فلاح کے لیے استعمال کرتے ہوئے تاریخ میں پہلا ’چیریٹی ہسپتال‘ قائم کیا۔ غزوہ بدر کے بعد بہت سے لوگ جن کے پاس نہ گھر تھا اور نہ پیسہ اور وہ زخمی تھے، انھوں نے مسجد نبوی کے ایک کونے میں نصب رُفیدہ کے خیمے میں اپنا مفت علاج کرایا اور صحت حاصل کی۔

نرسنگ کی بنیاد رکھنے والی خاتون

فلورنس نائٹنگیل سے صدیوں پہلے رُفیدہؓ کو بجا طور پر اسلامی دنیا کی پہلی نرس کہا جاتا ہے۔ انہوں نے نہ صرف خود خدمت انجام دی بلکہ دیگر خواتین کو بھی تربیت دی۔ ان کے قائم کردہ اصول—جیسے مریض کی عزت، رازداری، اور ہمدردی—آج بھی جدید نرسنگ کے بنیادی ستون سمجھے جاتے ہیں۔

ایک لازوال وراثت

بی بی سی اردو کے محقق اور مقالہ نگار وقار مصطفیٰ لکھتے ہیں:

"سنہ 1981 میں پہلی عرب پی ایچ ڈی نرس ڈاکٹر سعاد حسین نے رُفیدہ الاسلمیہ پر اپنی علمی تحقیق شائع کی، جسے جدید دور میں رُفیدہ الاسلمیہ کی خدمات کے دوبارہ تعارف اور قدر شناسی کا نقطۂ آغاز سمجھا جاتا ہے۔ سعاد حسین نے لکھا ہے کہ رُفیدہ نے اپنی زندگی نرسنگ کی ترقی اور بہتری کے لیے وقف کر دی۔ وہ بہتر نرسنگ کی بنیاد کے طور پر نئے اصول

اور روایات قائم کرنے میں کامیاب ہوئیں۔ پاکستان اور انڈیا سمیت دنیا کے کئی ممالک میں نرسنگ اور عمومی تعلیم کے کئی ادارے رُفیدہ الاسلمیہ کے نام پر ہیں۔

اسی طرح یونیورسٹی آف بحرین میں رائل کالج آف سرجنز اِن آئرلینڈ کی جانب سے ہر سال رُفیدہ الاسلمیہ انعام ایسے طلبا کو دیا جاتا ہے جو مریضوں کی دیکھ بھال میں مسلسل اعلیٰ معیار کی نرسنگ خدمات فراہم کرنے میں نمایاں کارکردگی دکھائیں۔"

رُفیدہ الاسلمیہؓ کی کہانی صرف تاریخ کا ایک باب نہیں، بلکہ ہر اُس عورت کے لیے ایک پیغام ہے جو اپنے اندر کچھ کرنے کا جذبہ رکھتی ہے۔ وہ ہمیں سکھاتی ہیں کہ ہمت، علم اور خدمت کا امتزاج انسان کو نہ صرف کامیاب بلکہ لازوال بنا دیتا ہے۔

ثوبیہ نورین

شہر الصیام سے شہر الطعام تک

کیا آپ تھوڑا سا غور و فکر کریں گے ؟ کچھ ہوش اڑا دینے والے حقائق
کو سمجھنے میں کہ خوشنما عبادتوں کی آڑ میں کیا ہو رہا ہے۔

رمضان آتے ہی عبادت کی تیاری ہمارے ہاں کچھ انوکھے ڈھنگ سے شروع ہوتی ہے۔ رمضان اب مذہبی شعار سے زیادہ ایک بھرپور کلچرل فیسٹول کا روپ دھار چکا ہے۔

افطاری کلچر

رمضان آتے ہی عبادت کی تیاری ہمارے ہاں کچھ انوکھے ڈھنگ سے شروع ہوتی ہے۔ رمضان اب مذہبی شعار سے زیادہ ایک بھرپور کلچرل فیسٹول کا روپ دھار چکا ہے۔

روزوں سے پہلے ہی اسٹوروں اور مارٹس میں راشن کی خریداری کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔ الماریاں اور فریزر گروسریز (اشیائے خورونوش) اور فروزن آئٹمز سے بھرنے لگتے ہیں۔ خواتین سموسوں اور رولز کی تیاری میں لگ جاتی ہیں اور کئی کئی گھنٹوں کی مشقت سے فاقے کے مہینے کے لیے چٹ پٹے اور لذیذ کھانوں کا بندوبست کر دیتی ہیں۔

ذرا رک کر سوچیے۔۔۔ کیا واقعی یہ بھوکا رہنے اور صبر و برداشت کا مہینہ رہا ہے ؟

یا ہم سب مل کر اسے آہستہ آہستہ شہرُ الصیام سے شہرُ الطعام میں تبدیل کر چکے ہیں ؟

یہ منظر صرف گھروں تک محدود نہیں۔ بازاروں، مسجدوں، نجی محفلوں اور ٹی وی چینلز غرض ہر جگہ یہی رونق میلہ اور کھیل تماشا جاری رہتا ہے۔

رمضان کا فائدہ بھی اب بسنت فیسٹول کی مانند بس یہ رہ گیا ہے کہ ہزاروں خاندانوں کے لیے ایک بزنس جنریشن کا محرک ثابت ہوتا ہے۔ اور ہم اس پر کس قدر مطمئن ہو چکے ہیں۔ آیئے کچھ جھلکیاں دیکھیے:

کھانوں میں تنوع (ورائٹی) اور قومی پستی

محنت کش لوگ پوری پوری رات بازاروں میں جاگتے ہیں تاکہ روزے داروں کے لیے پراٹھے، پوریاں، اور چائے ، لسی کا اہتمام وراتتمام کر سکیں۔

دوسری طرف گھروں میں مائیں، بیویاں اور بہو بہنیں تیرہ چودہ گھنٹے کے روزے کے لیے پندرہ سولہ گھنٹے کی محنت کرتی ہیں۔ کچھ خواتین شوہروں کے چاؤ سے، کچھ سسرال کے دباؤ سے تو کچھ محلے اور معاشرے میں بھرم رکھنے کے لیے، خاندان کی عزت و آبرو کی خاطر۔ البتہ کچھ ماؤں کی مامتا اس وقت تک مطمئن نہیں ہوتی جب تک وہ اپنے خاندان کے لئے پراٹھے، دودھ، انڈے، دہی، مکھن، دیسی گھی، دہی بھلے، پکوڑے، پوریاں، بروسٹ، بریانی، چنا چاٹ، فروٹ چاٹ، سموسے، کچوریاں، رولز، جلیبیاں، شیکس اور شربت کے انبار نہ لگا دیں۔ جیسے یہ غذائیں کھا کر آنکھوں کو وقتی سکون ملتا ہے، ویسے ہی اِن ماؤں کو اپنے لختِ جگروں کو یہ ڈھیر کھلا کر ہی اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

گویا ہر شخص اس مقدس مہینے میں عبادت کے طور پر اپنے ہی طریقے اختیار کیے ہوئے ہے اور پھر یہی مشقت ہمارے لیے عبادت کے نام پر کفایت بھی کرتی رہتی ہے۔

دعوتوں اور افطار پارٹیوں کا سیلاب اب ایسا ہے کہ رمضان کا لازم وملزوم محسوس ہوتا ہے۔ اب تو واعظین اور شوہر حضرات بھی رمضان کے تناظر میں افطاریوں کی فضیلتوں بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ ان انتظامات میں رجھی ہوئی بے بس عورتوں کی دل جوئی کے لیے یہ جملہ فرماتے ہیں کہ جو کسی کے لیے آسانی پیدا کرے، اللہ اس کے لیے آسانی پیدا کرتا ہے۔ کیونکہ سحر وافطار تو سنت ہے بھئی! یوں ہم ایک دوسرے کے لیے افطار کا بے شمار سامان مہیا کر کے ہی اب، خود کو رمضان کے اجر کا امیدوار سمجھتے ہیں۔

کھانا پینا برا ہے نہ دوسروں کو کھلانا۔ بات ہے قوم کے مزاج کی۔ نبی کریم نے فرمایا تھا: ابن آدم کی کمر سیدھی رکھنے کے لیے تو دو لقمے ہی کافی ہیں۔۔ یہ سب سرگرمیاں محض پیٹ بھرنے کی عکاس نہیں ہیں۔ بلکہ یہ پتہ دیتی ہیں کہ قوم کی ترجیحات و مقاصد کیا ہیں۔

قرآن نے ایک جگہ بنی اسرائیل کی زوال شدہ ذہنیت کو بے نقاب کرتے ہوئے ان کا اپنے نجات دہندہ، عظیم پیغمبر سے مطالبہ بیان کیا کہ:

لَن نَّصۡبِرَ عَلَىٰ طَعَامٍ وَاحِدٍ۔ البقرہ 61

ہم ہرگز ایک کھانے پر صبر نہیں کرسکتے، ذرا اپنے رمضان بازاروں کو دیکھیے۔ کیا ہمیں واقعی ایک کھانے پر صبر ہے؟ افطار کی میزوں کی تشہیر، کھانوں کی تصاویر، ریسیپیز کی بھرمار، افطار تیاری کی ویڈیوز، ہوٹلوں میں افطار بوفے... ہمیں لگتا ہے ہم عبادت کررہے ہیں؟ کیا ہم نے یہ سوچا کہ رمضان کے اس مہینے میں — جس میں خود بھوکا رہنا مقصود تھا — ہم نے کھانے کو ہی سب سے بڑا موضوع و مقصد کیوں بنادیا؟ یہ کام پورا سال ہوتا ہی ہے۔ مگر ہم نے اسی مہینے کو کیوں چنا جس کا مقصد نفس اور شہوات کو کمزور کرنا تھا؟ ذرا تنہائی میں بیٹھ کر سوچیں۔ اپنے دل سے پوچھیے۔

رمضان کا اصل مقصد کیا تھا؟

حالات یہاں تک پہنچ چکے ہیں کہ اگر کوئی یہ کہے کہ رمضان میں دل لگا کر کام کیجیے کیونکہ اس مہینے میں کچھ زیادہ فراغت و یکسوئی میسر آسکتی ہے، تو یہ بات لوگوں کو عجیب لگتی ہے۔ لیکن ذرا تنہائی میں خود سے پوچھیے: اگر سحر اور افطار صرف جسم کی اہم غذائی ضرورت کے مطابق ہوں تو کیا واقعی وقت کی کمی باقی رہے گی؟

گمشدہ شہر القرآن

رمضان دراصل شہر القرآن (قرآن کا مہینہ) ہے۔ تدبر و تفکر، ذاتی احتساب کا مہینہ۔ خالی پیٹ رہ کر اپنے نفس کو قابو میں رکھنے کی مشق کرنا، شعور بیدار کرکے دل اللہ کی طرف متوجہ کرنا یعنی روحانی اصلاح کے لیے وقت نکالنا اس مہینے کی بنیادی ترین ضرورت ہے۔ مگر ہمارے ہاں عالم یہ ہے کہ روزے میں عمومی سستی اور کمزوری کی سی کیفیت رہتی ہے، اور سحر و افطار کے بعد جو غنودگی طاری ہوتی ہے، اس کا علاج یا تو نیند میں ڈھونڈا جاتا ہے یا پھر موبائل کی ریلز میں۔ اور اگر فیملی ٹائم ہو تو ہم جھوٹ و فریب، اسراف و تبذیر پر مبنی، بندر تماشے جیسی رمضان نشریات اور پرکشش ڈراموں میں گھرے رہتے ہیں۔

یوں اللہ علیم و حکیم کی اس حکمت پر یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ خالی پیٹ رہنا دراصل انسان کو اعلیٰ روحانی مقاصد کے لیے تیار کرتا ہے۔ جب جسمانی تقاضے کمزور ہوتے ہیں تو سرکش خواہشات پر قابو پانا آسان ہو جاتا ہے۔ اس سے ایمان، شعور اور روحانی آگاہی (کانشس نیس) میں اضافہ ہوتا ہے۔

بھوک پیاس اور ذاتی اصلاح

کیا آپ نے اپنے رمضان کے وقت اور مقصد کے بارے میں سوچا ہے؟

یقین کیجئے، اسی کیفیت میں انسان اپنے کردار کو بہتر بنا سکتا ہے، بری عادتوں — مثلاً جھوٹ، غلط بیانی، غیبت، بے مقصد تبصرے، فضول تفریح، موبائل دیکھنے کی عادت، طنز و تمسخر اور بے مقصد گفتگو — پر قابو پا سکتا ہے۔ اگر ہم واقعی کم کھائیں اور کچھ وقت خاموشی اور تنہائی میں اپنے ساتھ گزاریں، راتوں کو تھوڑا سا قیام کریں، قرآن پڑھیں اور سمجھیں، اپنا کڑا احتساب کریں اور دعائیں مانگیں تو شاید ہمارا معاشرہ بہت سی بدتمیزیوں اور اخلاقی زوال سے بچ سکے۔

زکوٰۃ و خیرات کا بے ہنگم سلسلہ اور راشن مہمات ٹرینڈ

رمضان سے جڑا ایک اور ایک نمایاں مسئلہ ہے صدقہ و خیرات اور انفاق فی سبیل اللہ کی صورتوں میں پیدا ہونے والا بگاڑ۔ زکوٰۃ اور انفاق کی ترغیب دراصل معاشروں کے لیے خدا کی طرف سے ایسی رحمت بن سکتے ہیں کہ پست ترین معاشرہ بھی اگر اس حکم پر صحیح شعور اور حکمت کے ساتھ عمل کرے تو اٹھ کھڑا ہو۔ مگر جب انفاق کے مقاصد پیٹ کی فوری ضروریات اور مادی آسائشوں اور فوری تعریف و تسکین تک محدود ہو جائیں تو بلند تر مقاصد کے لیے خرچ کرنے کا تصور ہی ذہنوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا جو طبقہ پہلے محدود وسائل کے باعث سادہ زندگی گزار کر اصل معنوں میں روزے کی مشقت برداشت کرتا تھا، وہ بھی اب اپنا بہت سا وقت، پورا مہینہ جاری رہنے والی راشن مہمات کی دوڑ میں سرگرداں رہتا ہے۔ لوگوں کو سمجھائیں تو کہتے ہیں کہ روٹی کپڑا ضروری ہے اور آخر اس مہینے میں لوگوں کو رزق بانٹنے کا زیادہ ثواب ہے۔ اور کیا کریں ہم۔ اپنے زیادہ ثواب کے چکر میں ہم رمضان کی روح پامال کرتے جا رہے ہیں۔ یہی تو دھوکہ ہے شیطان کا۔ جس کے بارے میں اللہ نے اپنی کتاب میں ابلیس کے ہتھکنڈوں کو بیان کر دیا ہے:

وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ

"شیطان نے ان کے اعمال کو ان کے لیے خوشنما بنا دیا۔" (النمل:24)

سوچیے کہ ہم نے کیوں نہیں خود کو منظم کرنے یا کسی متبادل کا نہیں سوچا...

مردہ و مفاد پرست حکومتیں اگر کوئی اقدام نہ بھی کریں تو اہلِ علم اور اہلِ فراست ایسا اقدام کر سکتے ہیں کہ مخیر حضرات اور منظم سوچ رکھنے والے افراد (چند ایکسپرٹ لاجیشینز) کے ساتھ مل کر کسی کمیونٹی سطح کے منظم مالی نظام یا چھوٹے مگر باقاعدہ معاشی ماڈل کی بنیاد رکھ دیں تو بہت سا سرمایہ بار بار مانگنے والوں یا عدم اعتماد والے اداروں کے ہاتھوں ضائع ہونے سے بچ جائے۔ چھوٹے مگر منظم مالی ڈھانچے — چاہے وہ کمیونٹی فنڈز ہوں، تعلیمی معاونت کے نظام ہوں یا ہنر کی تربیت کے پروگرام — اللہ کے حکم پر عمل کے ساتھ ساتھ گردشِ زر اور منصفانہ تقسیمِ دولت کے مؤثر مواقع پیدا کرنے کا، سبب بن سکتے ہیں۔

مگر جب انفاق کا عمل بے ہنگم اور غیر منظم ہو جائے تو اس کے اثرات بالکل مختلف ہو جاتے ہیں۔ محدود آمدنی رکھنے والے افراد تعلیم، ہنر اور صلاحیتوں کو نکھارنے کے مواقع تلاش کرنے کے بجائے صدقہ وزکوٰۃ تقسیم کرنے والے گھروں کے پتے ڈھونڈتے نظر آتے ہیں۔ یوں وہ ایک ایسے خیراتی نظام کے حصہ دار بنتے جارہے ہیں جو نہ انہیں خود مختار بناتا ہے اور نہ معاشرے کو مضبوط۔ اس صورتحال کا ایک اور نقصان یہ بھی ہے کہ مسکین خاندانوں کی بچی کچی عزتِ نفس متاثر ہوتی جارہی ہے اور معاشرے میں انحصار (dependency) کا رجحان بڑھتا جارہا ہے۔

ہم اپنی صدقات کی عبادت پر مطمئن ہو جاتے ہیں، مگر اجتماعی تدبر کے فقدان کے باعث یہ احساس کم ہی ہوتا ہے کہ کہیں ہم خود ہی ایک شارٹ کٹ ذہنیت کو پروان تو نہیں چڑھا رہے۔ سب تو یہ ہے کہ جب فوری ضرورتوں کی تسکین ہی اصل مقصد بن جائے تو لوگ اپنی صلاحیتیں نکھارنے اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی لمبی جدوجہد سے بتدریج دور ہونے لگتے ہیں۔ یوں غربا اس نظام سے نکلنے کے بجائے اسی کے مستقل حصہ دار بنتے چلے جاتے ہیں۔

زکوٰۃ وصدقات کی یہی بے ترتیب تقسیم ان لوگوں کے لیے بھی حوصلہ شکنی کا باعث بنتی ہے جو محنت، تعلیم اور طویل المدت منصوبوں کے ذریعے معاشرے کو بہتر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگرچہ مخیر حضرات کی کمی نہیں، مگر ہمارے معاشرے میں غریب کو کھانا کھلانا یا کسی بیوہ کی بیٹی کو جہیز دینا بڑی نیکی سمجھا جاتا ہے۔ لوگوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنا، اپنی اور دوسروں کو تعلیم وتربیت پہ خرچ کرنا، اعلیٰ کردار کی تعمیر اور صلاحیتوں کا حصول اتنا اہم نہیں سمجھا جاتا۔

اسی کا تو نتیجہ ہے کہ صدقہ وزکوٰۃ کے نام پر ہونے والا انفاق فی سبیل اللہ نہ تو تعلیمی وتربیتی منصوبوں پر خرچ ہوتا ہے، نہ تحقیق وریسرچ کے اداروں پر، نہ ایسے اداروں اور افراد کی تقویت پر جو معاشرے کے لیے طویل المدت وژن رکھتے ہیں۔ وسیع النظر اور دور اندیش لوگوں کی معاونت کے بجائے زیادہ تر وسائل ان سرگرمیوں پر صرف ہو جاتے ہیں جو وقتی اور سطحی اطمینان تو دے دیتی ہیں مگر معاشرے کی بنیادوں کو مضبوط نہیں کرتیں۔

امیروں کی تجوریوں کے منہ کھلتے بھی ہیں تو پر تکلف افطار کے ڈبے بانٹنے کے لئے، لمبے دستر خوانوں کو سجانے، راشن پیکجز کی تقسیم اور مساجد میں افطاریوں کی نمائش وغیرہ کے لئے۔ چند امراء تو نام کے فلاحی اداروں میں راشن، پانی کی تقسیم کی تقریب کرکے بعد ازاں اُن تصاویر وویڈیوز کی تشہیر سے مزید چندے، فطرانے اور چیریٹی بٹور کے ذاتی جیبیں بھرتے ہیں۔ کچھ اور اہل ثروت بیواوں کی مدد کرتے ہیں یا کسی یتیم کی کفالت۔ مگر یہ سب انفرادی حیثیت ہی میں ہوتا ہے۔

یہ سب یقیناً بامعنی کام ہو سکتے ہیں، مگر سوال یہ ہے کہ کیا یہ کام صرف رمضان ہی کے محتاج ہیں؟ کیا ان اقدامات کا انجام افراد کو خود مختار بنانے میں نکلے گا یا ایک پورے معاشرے کو مستقل محتاجی کی طرف دھکیل دے گا؟

نیک اعمال کا جھانسا اور شیطان کا دھوکا

ہمیں چوکنا ہونا ہے کہ شیطان بہت بڑے گناہ بھی نیکی کے خوبصورت لبادے میں کراتا ہے۔ شرک کی ابتدا بہت نیک تصور سے ہوئی۔ بیواوں کے مہر میں زیادتی بڑے نیک مقصد سے شروع ہوئی۔ اسی طرح آپ پورے رمضان کی سرگرمیوں کا جذباتی ہوئے بغیر ہوشمندی سے جائزہ لیں تو آپکو اندازہ ہو گا کہ ہم اجر و ثواب کے ایسے فریب میں مبتلا ہیں، جس سے نکلنا امرِ محال لگتا ہے۔

سچ کہوں تو یہ خوشنما عبادتوں کا دھوکہ، عالمی جنگوں کے مسلط ہونے سے بھی زیادہ خطرناک ہے کیونکہ یہ تخریبی جنگیں اللہ کی رضا پانے اور اجر کی امید سے نہیں شروع کی جاتیں اسی لیے انکی شناعت واضح ہوتی ہے۔ اور ختم ہونے کا امکان بھی۔ مگر رمضان کے یہ سب اعمال_پر کشش افطاریاں، راشن پیکجز، سستے بازار، اور پاروں کی دوڑ_ کو نیکی کی خوبصورت آڑ میسر ہے۔ اور یہ گمان بھی نہیں گزرتا کہ رمضان المبارک میں کیے جانے والے سارے اعمال بظاہر نیکی کہ ہیں مگر رمضان کی روح اور اصل مقصد سے بہت دور لے جانیوالے ہیں— مگر انسان سوئے فہم کا شکار ہوتا ہے کہ گویا ہم نیکی کر رہے ہیں۔

سورہ حدید میں ایک گروہ کے بارے میں فرمایا:

وَ غَرَّتْكُمُ الْاَمَانِیُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَ غَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ

اور تمہیں تمہاری فضول تمناؤں نے دھوکے میں ہی رکھا یہاں تک کہ اللہ کا حکم آپہنچا اور تمہیں اللہ کے بارے میں دھوکہ دینے والے (شیطان) تمہیں مبتلائے فریب ہی رکھا۔

ہم اپنے گریبان میں جھانکیں۔

ہو سکتا ہے ہمیں محسوس ہو کہ رمضان کی ساری رونقیں اور رسوم—افطار کے دسترخوان، تراویح کی گنتی، صدقات کی نمائش— کہیں نہ کہیں ہمیں اصل مقصد سے دور لے جا رہی ہیں۔

اور اگر ایسا ہے تو ہمیں اپنے نفس کی خواہشات کی پیروی سے باز رہنا ہو گا۔

نمازِ تراویح اور قلتِ تدبر

رمضان وہ مہینہ ہے جس کی اصل اہمیت قرآن سے تعلق میں ہے—تنہائی میں غور و فکر، تدبر اور اعتکاف میں۔ قرآن خود اس کی بنیاد یوں بیان کرتا ہے

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ:

"رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا۔"

(البقرۃ:185)

اسی مہینے کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''مَنْ صَامَ رَمَضَانَ إِيمَانًا وَاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ''

''جس نے رمضان کے روزے ایمان اور احتساب کے ساتھ رکھے، اس کے پچھلے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔''

(صحیح البخاری، صحیح مسلم) اور فرمایا:

''مَنْ قَامَ رَمَضَانَ إِيمَانًا وَاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ''

''جس نے رمضان میں قیام (رات کی عبادت) ایمان اور احتساب کے ساتھ کیا، اس کے بھی پچھلے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔'' (صحیح البخاری، صحیح مسلم)

ایمان اور احتساب

ہمیں بچوں کو روزہ رکھوانے کی بڑی جلدی ہوتی ہے لیکن قبولیت کے اصل معیارات کی تربیت نہ ہونے برابر کرتے ہیں۔ تو ایمان و احتساب کیا ہیں؟

"احتساب یہ ہے کہ انسان اپنے ہر عمل کو کٹہرے میں کھڑا کرے، اپنے ارادوں اور محرکات کو پرکھے، اپنی خرابیوں کو پہچانے اور ندامت کے ساتھ اصلاح کی طرف بڑھے۔ قیام اللیل صرف کھڑے رہنے کا نام نہیں بلکہ اپنے نفس کا محاسبہ کرتے ہوئے اللہ کے حضور جھکنے کا نام ہے۔"

مگر اسی مہینے میں ہم نے کیسا منظر بنا لیا ہے؟

ہر طرف سوشل میل جول، دعوتیں، اجتماعات۔ ان سب کے لیے آیات بھی پیش کی جاتی ہیں کہ صلہ رحمی تو مطلوب ہے۔ یقیناً مطلوب ہے، مگر رمضان اصل میں مجاہدۂ نفس کا مہینہ ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی لغو بات کرے تو ہدایت یہ ہے کہ وقت ضائع نہ کرو بلکہ کہہ دو:

اِنِّي صَائِمٌ ”میں روزے سے ہوں۔“ (البخاری، و مسلم) گویا روزہ انسان کو اپنے اندر کی تعمیر اور تفکر کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔

لیکن ہمارے ہاں تو عبادت کے نام پر ایک اور ہجوم برپا ہو جاتا ہے۔ دن میں اداروں میں دورۂ قرآن کے نام پر ترجمے کی رفتار اتنی تیز ہوتی ہے کہ آیات گزر جاتی ہیں مگر دل تک نہیں پہنچتیں۔ رات کو تراویح کی گہما گہمی سے مسجدیں روشن ہوتی ہیں۔ اب خواتین بھی ان نورانی محفلوں میں شریک ہوتی ہیں۔ صاف ستھرے لباس، دوستوں سے ملاقاتیں، تراویح کے وقفوں میں چائے اور افطار آئیٹمز کے ساتھ، دن بھر کی مصروفیات کی گپ شپ۔۔۔ عورتوں اور بچوں کے لئے خاصی اچھی ایکٹیوٹی ہے مگر صیام و قیام کے نام پر نہیں۔ پھر راتوں میں رمضان نشریاتوں کے چرچے، بازارون میں برانڈز اور پراڈکٹس پہ رمضان سیلز اور لوگوں کا جم غفیر... لہزا ایک سوال دل میں ابھرنا چاہیے۔ ان تراویح اور نوافل میں تدبر کتنا ہے؟

قرآن کی آیات بجلی کی رفتار سے گزر جاتی ہیں۔ ہم سنتے ہیں مگر سمجھتے نہیں۔ ہم کھڑے رہتے ہیں مگر دل کہیں اور ہوتا ہے۔ تعداد بڑھتی ہے مگر کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ حالانکہ قرآن ایمان والوں کی ایک علامت یوں بیان کرتا ہے:

وَالَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوا عَلَيْهَا صُمًّا وَعُمْيَانًا

”اور جب انہیں ان کے رب کی آیات یاد دلائی جاتی ہیں تو وہ ان پر اندھے اور بہرے ہو کر نہیں گرتے۔“

(الفرقان:73)

تو پھر ہمیں خود سے پوچھنا چاہیے:

کیا ہم نے واقعی رمضان میں عبادت کی ہے... یا صرف عبادت کی رونقیں پیدا کی ہیں؟

مگر قرآن ہمیں ایک اور حقیقت بھی بتاتا ہے۔

وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ

شیطان نے ان کے اعمال کو ان کے لیے خوشنما بنا دیا۔“

(النمل:24)

سوچیے اگر شیطان کا سب سے بڑا ہتھیار یہی ہو کہ وہ ہمارے اعمال کو خوبصورت بنا دے تو؟ پھر ہمیں کبھی محسوس ہی نہیں ہو گا کہ ہم غلطی کر رہے ہیں۔ ہم سمجھیں گے ہم عبادت کر رہے ہیں، حالانکہ ہم اصل مقصد سے دور جا رہے ہوں گے۔

اور یہی تو شیطان کا دعویٰ تھا۔ اب ذرا اپنے ارد گرد دیکھیے کیا ہم واقعی اس دعوے کا نشانہ نہیں بن چکے اور اگر ایسا ہے۔ تو شاید شیطان کا وہ دعویٰ آج ہمارے معاشرے کی گلی گلی میں سچ ہوتا نظر آ رہا ہے۔

وَلَأُضِلَّنَّهُمْ وَلَأُمَنِّيَنَّهُمْ

"میں انہیں گمراہ بھی کروں گا اور جھوٹی آرزوؤں میں مبتلا بھی کروں گا" (النساء119)

نعیم احمد بلوچ

رجا: جب امید بن کر نمودار ہوئی

ایک باپ کی اپنی بیٹی کی رخصتی پر دل سے نکلی تحریر: بیٹی کے
بچپن سے لے کر رخصتی تک کا دل نواز حال

یہ آج سے تیس برس پہلے کی بات ہے۔ میں بھی عام مردوں کی طرح بیٹیوں کی پیدایش کو "اللہ کی رضا" سمجھ کر مجبوراً قبول کرتا اور بیٹوں کی ولادت کو اللہ کی خصوصی نعمت سمجھتا تھا۔ اسی لیے "اولادِ نرینہ" ہی کی دعا کرتا۔ مگر اللہ نے پہلی اولاد کے طور پر بیٹی عنایت کی اور صبا گھر کی رونق ٹھہری۔ خوشی لاریب ہوئی کہ صاحبِ اولاد ہو گیا لیکن ایک گونا محرومی ضرور محسوس کی۔ دوسرے بچے کی تمہید بندھی تو بیٹے کی شدید خواہش دن رات کی دعاؤں میں ڈھل گئی۔ اور جب معمول کے طبی معاینے کے دوران میں بیگم کے اس سوال کو ڈاکٹر نے نظر انداز کر دیا کہ لڑکا ہے یا لڑکی تو میں سمجھ گیا کہ بیٹے کی تمنا اس دفعہ بھی آسودہ خاطر نہیں ہو گی۔

میں نے کسی طرح اہلیہ کو تو جھوٹی تسلی دلا دی لیکن خود کو اللہ سے شکوہ کناں پایا۔ اندرونی کیفیت پر قابو پانا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ اور یہ انھی دنوں کی بات ہے کہ مطالعے کے دوران میں مجھے سورہ آل عمران کی ان آیات کو تلاوت کرنے کا موقع ملا جنھوں نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ میں جیسے جیسے ان آیات کو پڑھ رہا تھا میرے جسم میں سنسنی کی ایک لہر گہری ہوتی جا رہی تھی۔ بے اختیار اپنی کج فہمی اور کوتاہ نظری پر افسوس اور دل معافی کی دعا سے معمور ہونے لگا۔

پروردگار نے ان آیات میں حضرت مریم کی والدہ (حنہ خاتون) کے بارے میں بتایا کہ انھوں نے منت مانی تھی کہ بیٹا ہوا تو اسے اللہ کی خدمت میں وقف کر دیں گی۔ لیکن ان کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی۔ انھیں خاصی مایوسی ہوئی۔ بولیں:

ناقابل فراموش

پروردگار، یہ تو بیٹی ہے، بیٹے کی طرح تو نہیں کہ تیرے حضور پیش کروں۔ ان کے خیال میں لڑکیوں کا یہ مقام کہاں کہ وہ اللہ کے گھر کی خدمت کی اہل ہوں۔ مگر وہ تو پروردگار ہے، اس نے سب سے پہلے اس بات کی عملی نفی کی کہ اللہ صرف مردوں ہی کو وحی کرتا ہے، اس کے نزدیک وحی کے لیے اس نے مرد اور عورت کی تفریق روا نہیں رکھی۔ چنانچہ اپنے فرشتے کے ذریعے سے وحی کی اور فرمایا، مجھے لڑکا نہیں، یہ لڑکی مریم ہی قبول ہے۔ تم اسے ہی میری خدمت کے لیے وقف کردو۔ گویا بتا دیا کہ میں نے کب کہا ہے کہ اللہ کے دین کی خدمت صرف مرد ہی کر سکتا ہے۔ مجھے عورت بھی قبول ہے۔ اور تمہاری بیٹی سے اللہ کو جو خدمت چاہیے، وہ مرد کی طاقت اور صلاحیت سے باہر ہے، اس کے لیے لڑکی ہی چاہیے۔ اسی لیے تمہیں لڑکی ہی دی ہے۔ اسے اس کے خالو 'زکریا' نبی کی تربیت میں دینا۔ اللہ اس سے عظیم خدمت لے گا۔

اور مجھے پہلی دفعہ شعوری طور پر معلوم ہو رہا تھا کہ بیٹا یا بیٹی، جو بھی ہو، انسان کی خواہش سے نہیں اللہ کی مشیت سے پیدا ہوتے ہیں۔ (مذہب پر یقین نہ رکھنے والے دوست، ہو سکتا ہے آج کے انسان کی اس صلاحیت کو پیش کریں کہ وہ اب اس پر قدرت رکھتا ہے کہ چاہے تو بیٹی کا انتخاب کر لے یا بیٹے کا لیکن عرض ہے کہ اللہ نے انسان کو اپنی مشیت کی خلاف ورزی کا اختیار دے رکھا ہے۔ آپ بے شک اپنی ذمہ داری پر ایسا کر سکتے ہیں۔) اس لیے اللہ کے ماننے والوں کو یہ ہرگز زیبا نہیں کہ وہ بیٹی کے الہامی فیصلے پر محرومی یا تنگی محسوس کریں۔ بیٹی کا فیصلہ ہے تو یہ یقین کر لے کہ یہی اس کے لیے بہترین ہے۔ بیٹے اگر ناگزیر نعمت ہوتے اور بیٹیاں یقینی طور پر زحمت ہوتیں تو اللہ اپنے سب سے پسندیدہ انسان "محمد [صلی اللہ علیہ وسلم] بن عبد اللہ" کو بیٹوں کے بجائے بیٹیاں عنایت نہ کرتا۔ یوں میرے بھیجے میں پہلی دفعہ یہ بات پڑی کہ بیٹی کی پیدایش پر افسوس اور محرومی کا اظہار یقیناً کوتاہ نظری بھی ہے اور حماقت بھی۔

لیکن مجھے وہ وقت نہیں بھولتا جب میری دوسری بیٹی پیدا ہوئی تو اس کا کس بے قدری اور بے بسی سے استقبال کیا گیا۔ میری نظروں میں ددھیال اور ننھیال دونوں کی خواتین کے اترے اور نچڑے چہرے گھوم جاتے ہیں جس پر مجھے بہت غصہ آرہا تھا مگر میں اس خبر کے لیے تیار بھی تھا اور بہت حد تک مطمئن بھی۔ شاید خواتین کے اس ردعمل کی وجہ یہ بھی رہی ہو کہ یہ اپنے چار کزنوں کے درمیان پیدا ہونے والی واحد لڑکی تھی۔ اسی لیے صبا کا نام تو بڑے مشوروں کے بعد اس کے دادا نے خود رکھا لیکن اب کسی کو کوئی پروانہ تھی۔ یہ دوسرا دن تھا کہ کسی نے پوچھنے پر توجہ دلائی کہ "بیم و رجا" میں "رجا" بھی ایک نام ہو سکتا ہے۔ مجھے یہ نام اتنا اچھا اور منفرد لگا کہ بڑی خوشی سے اسے یہ نام دے دیا۔ میرا اطمینان اور خوشی دیکھ کر اسی وقت ننھیال نے اعلان کر دیا کہ رجا تو "ابو کی بیٹی" ہے! اور رجا پھر ابو ہی کی بیٹی بنی۔ سب

ناقابل فراموش

سے زیادہ وہ مجھ ہی سے مانوس رہی ہے۔ اگرچہ چند ہفتوں ہی کے بعد اس نے مجھے الطاف حسین حالی کی نظم "چپ کی داد" یاد دلادی جو کسی زمانے میں حصہ نصاب تھی اور 'رجا' اس کی مجسم تصویر۔

آتی ہو اکثر بے طلب، دنیا میں جب آتی ہو تم
پر موہنی سے اپنی یہاں، گھر بھر میں چھا جاتی ہو تم

شاید اسے بھی اس کا احساس ہو چکا تھا اس لیے چند ہفتوں ہی کی عمر میں جب میں اس کے کمرے میں داخل ہوتا تو اس کی نظریں مجھ پر ٹک جاتیں۔ اور وہ فیڈر کی اوٹ سے مجھے دیکھ کر مسکراتی۔ میں کمرے سے باہر نکلتا تو اس کی والدہ ناصرہ بیگم حیرت سے کہتیں کہ دیکھیں، اب بھی آپ ہی کی طرف دیکھ رہی ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ صبا نے محبت پہلی بیٹی ہوتے ہوئے سمیٹی تو رجا نے اپنی پیاری باتوں، ذہین عادتوں اور چلبلی حرکتوں سے کمائی۔

ذرا شعور سنبھالا تو مجھ سے کہانی سننے کی عادت میں صبا سے بھی بازی لے گئی۔ کچھ برس تو بھینس اور چڑیا کی کہانی اس باقاعدگی سے سنی کہ میں سناتے ہوئے سو بھی جاتا تو خود بخود رٹے رٹائے الفاظ منہ سے نکلتے رہتے۔ کہانی سننے سنانے کا یہ سلسلہ ایسا شروع ہوا کہ آٹھویں کلاس تک جاری رہا۔ شروع میں دنیا کے سارے ظالم، خوب صورت، حیرت انگیز اور شرارتی جانور، کلاسیکی اور لوک کہانیوں کے اودھم مچانے والے سبھی کردار اس کی دنیا کا حصہ بنے۔

پھر پیغمبروں کی سچی کہانیوں سے لے کر میری لکھی ہوئی ساری کہانیاں۔ سب ختم ہو گئیں، میں نے لطیفوں کو کھینچ کر کہانیاں بنانا شروع کر دیں، بچپن کے واقعات کی کھچڑی بنا کر سنا ڈالا، اپنے تخیل کی ساری وادیاں کھوج ڈالیں مگر رجا کی کہانی سے محبت تشنہ ہی رہی۔ اس معاملے میں اس کی یادداشت کمال کی تھی۔ کہانی کے پہلے جملے ہی کو اچک کر بتا دیتی کی سنی ہوئی ہے، نئی سنائیں۔ وہ صرف مزاحیہ کہانی ہی بار بار سننا پسند کرتی۔ اور بے چاری صبا کو بھی یہ سننی پڑتی۔ بڑھاپے والی کہانی تو شاید سینکڑوں دفعہ سنی ہو۔ اور شاید اب بھی سننے کا ارادہ ہو۔

اصل میں آج کے بچے اگر موبائل اور ٹیبلیٹ کے رسیا ہیں، تو اس کے لیے "ابو" ہی موبائل تھے۔ وہی گھوڑا اور وہی جھولا، وہی کمپیوٹر گیمز تھے۔ میں یقیناً یہ سمجھتا ہوں کی میری بڑی دونوں بیٹیوں کی شان دار شخصیت میں اس چیز کا بنیادی کردار ہے۔

ناقابل فراموش

رجا کی شرارتیں، فرمایشیں اور سوالات بڑے مختلف ہوتے تھے۔ وہ ہمیشہ گھر پہنچنے پر گاڑی میں سوئی ہوئی "پائی" جاتی۔ اور یوں ابو اسے اٹھا کر اندر لاتے۔ اکثر کمرے میں داخل ہوتے ہی قہقہہ لگاتی۔ دوران سفر کوئی کھانے کی چیز لینی ہوتی تو پاس گزرتے ہوئے "گورمے" قسم کے سٹورز کو کہتی: "بائے بائے گورمے، مس یو" سوالات اس قدر کرتی کہ خدا کی پناہ۔ مگر اس میں ندرت ہوتی۔ اسے اللہ تعالیٰ کی "لمبائی چوڑائی" جاننے کا بہت شوق تھا۔ کیونکہ اس کا "بہت بڑا" ہونا اس کے کچھ پلے نہ پڑتا۔ ایک دفعہ ماڈل ٹاؤن سے کنال روڈ پر چڑھے اور جلو پارک جاتے ہوئے کنال روڈ ہی پر رہے۔ جب گاڑی کئی کلو میٹر سفر کرتی ہوئی، اس روڈ کو چھوڑ کر پارک کی طرف مڑی تو بولی: "ابو، کیا اللہ تعالیٰ اس نہر سے بھی لمبے ہیں؟"

دوسرے اس کے سوالوں سے بہت زچ ہوتے اور اکثر اسے ڈانٹ بھی پڑتی، اس لیے میں ہی اس کا 'وکی پیڈیا' اور 'گوگل' تھا۔ اس کا یہ سوال تو شاید اب بھی تشنہ جواب ہو کہ آخر اللہ کو کیا سوجھی کہ اس نے انسان کو بنایا؟ اور یہ عادت تو آج بھی برقرار ہے کہ گھر آ کر ماں باپ یا جو بھی اپنا سامنے ہو، اسے سکول کی ساری کہانی، ساری بپتا، ساری روداد سنانی ہے، پھر کالج پہنچی تو کالج کی، یونیورسٹی پہنچی تو اس کی اور دفتر پہنچی تو اس کی بھی۔ [اس لیے بیٹے ولید، تیار ہو جاؤ]

اس کی گپ شپ اور سوالوں کی بہتات کو دیکھتے ہوئے صبا نے اسے کھلی چھٹی دے رکھی تھی کہ اگر میں اکیلے کہیں جا رہا ہوں تو وہ گاڑی میں میرے ساتھ جائے۔ اور یہ عادت اس وقت بھی نہ چھوٹی جب یہ اللہ مارے موبائل مردود معاشرتی زندگی کی متعدد خوشیوں کے ڈاکو اور دور جدید کی ناگزیر ضرورت بنے۔ اس نے موبائل سیکنڈ ایئر میں لیا اور اسے بہت تمیز اور حدود میں رہ کر استعمال کیا۔ والدین کو صبا اور رجا، دونوں نے کبھی یہ پچھتانے کا موقع نہ دیا کہ کاش نہ لے کر دیا ہوتا۔

امی ابو کی لڑائی میں وہ ہمیشہ غیر جانب دار رہتی۔ اس کا موقف ہے کہ والدین میں لڑائی ہونی ہی نہیں چاہیے، اگر ہوتی ہے تو اسے بچوں کے علم میں نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو والدین دونوں ذمہ دار ہیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا۔ وہ لڑے ہیں تو پھر اس کے ذمہ دار بھی ہیں۔ چنانچہ اس معاملے میں اس نے کبھی میری یک طرفہ حمایت نہیں کی۔ اپنی والدہ کے انتقال کے بعد جب اسے سوتیلی ماں کے ساتھ رہنا پڑا تو تب بھی اس کی یہی رائے اور یہی عملی رویہ رہا۔

میں ذاتی طور پر اپنے بچوں کو پورا حق دیتا ہوں کہ وہ مجھ پر تنقید کریں اور میری رائے سے اختلاف رکھیں۔ چنانچہ ایسا کئی دفعہ ہوا کہ اس نے میرے مقابلے میں زیبا کی حمایت کی اور میرے رویے پر تنقید کی۔ [اس حوالے سے اس کی بڑی

بہن صبا کا بھی یہی رویہ رہا۔] میری دعا ہے کہ وہ اپنے بچوں کے بارے میں اس شان دار اور صائب رائے پر قائم رہے۔ کیونکہ بچوں کے لیے گھر تب محفوظ جنت ہے جب والدین اپنی لڑائی کو بھی اپنی پرائیویسی کا حصہ بناتے ہیں۔

وہ سائنس کی طالبہ ہے اور الیکٹرک انجینئر لیکن اس کا لٹریچر سے لگاؤ میرے لیے بہت اطمینان کا باعث بنا۔ اس میں لکھنے کی صلاحیت دیکھ کر اسے میں نے ایک آئیڈیا دیا کہ وہ روزنامہ جناح کے بچوں کے ہفتہ وار میگزین "فرینڈز" میں کارٹون پروفائل لکھے۔ اسے کارٹون دیکھنے کا شوق نہیں، خبط تھا۔ یوں اس نے معروف کرداروں کے پروفائل لکھے۔ اسے یہ ایک 'بور' کام لگا تو میں نے کہا کہ اسے اخبار والے ایک پروفائل لکھنے کا سو روپے معاوضہ دیں گے۔

وہ ہماری [میں ان دنوں روزنامہ جناح میں شعبہ میگزین کا انچارج تھا] "پیڈ رائٹر" ہو گی اور اسے باقاعدہ کارڈ بھی ایشو کیا جائے گا۔ تب اس کی دلچسپی قائم ہو گئی لیکن جب بہت بعد میں، میں نے یہ راز افشا کیا کہ وہ سو روپے اسے میں دیتا تھا تو بہت مایوس ہوئی۔ لیکن اس کی لکھنے کی صلاحیت پختہ ہو گئی۔ اب وہ ایک کامیاب کانٹنٹ رائیٹر بھی ہے۔ (چھ برس پہلے) اور اس نے میرے ساتھ یہ وعدہ بھی کر رکھا ہے وہ میرے ناول کے پراجیکٹ "دی برج" کی معاون مصنفہ ہو گی۔ [اس ناول پر تحقیقی کام شروع ہے، موجودہ زیر تصنیف پراجیکٹ "صبح کا ستارہ" کے مکمل ہونے سے اسکرپٹ لکھنے کا آغاز ہو جائے گا۔ ان شاء اللہ]

میرا اس کے بارے میں یہی خیال تھا کہ وہ انگلش لٹریچر کو اپنا مستقبل بنائے مگر جب اسے فاسٹ یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا تو مسائل کے باوجود میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی اور اس نے بڑی چابک دستی اور ذہانت سے اپنی ڈگری مکمل کی اور رزلٹ آنے سے پہلے ہی ایک باوقار ادارے میں ایسی جاب حاصل کر لی جو کم از کم ایک برس کے تجربے کے بعد ہی مل سکتی تھی۔

پچھلے برس جولائی کی بات ہے کہ اس نے گھر آ کر میری مسز زیبا کو حسب عادت دفتر کی کہانی سناتے ہوئے بتایا کہ آنٹی [دونوں اپنی سوتیلی والدہ کو آنٹی کہتی ہیں] آج عجیب بات ہوئی۔ وہ ولید ہے نا، جس کے بارے میں آپ کو بتاتی رہتی ہوں کہ ہم لڑکیوں کو اس کی ٹُک کا کھانا بہت پسند ہے، اس نے نئی کمپنی جوائن کر لی ہے۔ آج اس کی فیئرول پارٹی تھی۔ لیکن ساتھ ہی اس نے عجیب بات کی ہے۔ جاتے ہوئے مجھے کہا کہ اگر تمہیں برا نہ لگے تو تمہارے گھر اپنے والدین کو بھیجنا چاہتا ہوں۔

زیبا نے مجھ سے بات کی تو ہم دونوں نے پہلے ولید کو جاننے کا فیصلہ کیا۔ میں نے اسے دفتر بلا لیا۔ اتنی بات تو واضح تھی کہ اگر رجا کو اس کا پوچھنا برا لگتا تو وہ گھر آ کر بالکل ذکر نہ کرتی۔ وہ سہیلیاں بنانے میں بھی خاصی محتاط رہی ہے۔ اپنے

مزاج اور دوسرے کی عادات کا خاص خیال رکھتی ہے اور پھر دوستی نبھاتی بھی ہے۔ سکول سے اس کی دو سہیلیاں ہیں، انیقہ اور غنوہ۔ پھر کالج سے عائزہ اور یونیورسٹی سے غوثیہ۔ سبھی گھر آتی رہی ہیں، بہت سلجھی بچیاں ہیں۔ اور آخر میں رجا نے وہ بات کر دی کہ میرا سر فخر سے بلند اور آنکھیں تشکر سے بھیگ گئیں۔ اس نے کہا:

"ابو، میں نے اسے بہت صاف لفظوں میں کہہ دیا ہے... آپ کے جذبات جو بھی ہیں، اصل اور آخری فیصلہ میرے والد کا ہو گا۔ یہ ذہن میں رکھیں۔"

یہ میرے لیے انتہائی اطمینان کی بات تھی کہ اس نے میری اس رائے اور پالیسی کو درست ثابت کیا ہے کہ بچوں کی اچھی تربیت کی جائے اور ان کو نیک و بد کی تمیز سکھلا کر بااختیار بنایا جائے تو وہ کبھی مایوس نہیں کرتے۔ اس لیے مجھے پہلے مرحلے میں بہت خوشی اور اطمینان ہوا، لیکن یہ معاملہ نازک تھا۔ میں نے ابتدائی معلومات لینے کے بعد مناسب خیال کیا کہ پہلے ولید سے مل لینا چاہیے۔ اور ایسا ہی ہوا۔ وہ ایک شریف النفس لڑکا محسوس ہوا۔

میں نے پوچھا: رجا ہی کیوں؟ بولا: دماغ سے سوچتی ہے اور پھر دل کی مانتی ہے۔ یہ اس کے اور میرے درمیان قدر مشترک ہے۔

میں نے اسے بہت "کمپوزڈ" پایا۔ میں نے اس کی باڈی لنگویج سے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ لڑکا دل سے بول رہا ہے۔ تصنع نہیں ہے۔ تب میں نے یہ جانا کہ وہ مذہب بیزار ہے کہ مذہب دوست؟ وہ اس میں بھی معیار پر پورا اترا۔ آدھ گھنٹے کی یہ ملاقات اس جملے پر تمام ہوئی:

"آپ انٹرویو میں پاس ہو، والدین کو بھیجیں۔"

اس کے بعد خاندان کے باہمی مشورے اور رضامندی سے بات طے ہو گئی۔

میں نے پہلے ہی یہ اعلان کر رکھا تھا کہ ٹونٹی ٹونٹی رجا کی شادی کا برس ہو گا اور اب اللہ تعالیٰ نے اسے پورا کرنے کا موقع پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ تیاریاں شروع ہو گئیں۔ شاپنگ میرے لیے ہمیشہ سے ایک ناپسندیدہ مشغلہ رہا ہے، خاص طور پر جس میں بھاؤ تاؤ کرنا پڑے اور ہماری بیگم صاحبہ کو یہ اتنا ہی مرغوب۔ چنانچہ صبا کی طرح اس دفعہ بھی یہ مشکل اور انتہائی ضروری کام انھوں نے انجام دیا اور حسب سابق بہت خوب کیا۔ صرف شاپنگ ہی نہیں خواتین سے متعلق کم و بیش سارے معاملات انتہائی چابک دستی اور مہارت سے انجام دیے۔ دونوں بہنیں اس دفعہ بھی ان سے بہت خوش اور مطمئن رہیں۔ ایک سوتیلی ماں کے ساتھ بچیوں کا یہ اطمینان اللہ کی خصوصی نعمت ہے۔ یقیناً اس میں دونوں طرف سے سمجھ داری اور نیک نیتی کا عمل دخل رہا ہے۔

ناقابل فراموش

شادی بیاہ کے معاملے میں میری یہ رائے رہی ہے اسے باوقار مگر فضول خرچی سے پاک ہونا چاہیے۔ شیخ ظہیر احمد اور ان کی اہلیہ عشرت بیگم بھی اس میں ہم خیال نکلے۔ خاندانی لوگ ہیں، سب اہم امور بغیر کسی اختلاف رائے سے کامل اتفاق سے طے ہوئے کہ منگنی کے بجائے پہلے نکاح کی تقریب ہو گی اور پھر دونوں خاندانوں کے گھر کے قریبی احباب مہندی میں شریک ہوں۔ ولیمہ اور رخصتی کی تقریب ''شلیمے'' کی جدت سے ماخوذ ایک ہی ہو گی۔ پرنس ہال کیونکہ شیخ ظہیر صاحب کے داماد کا تھا، اس لیے اسی کا انتخاب کیا گیا اور یہ فیصلہ ایک ایسی نعمت ثابت ہوا جس کا بیان لفظوں میں نہیں ہو سکتا۔

چودہ اور پندرہ مارچ کی تاریخیں متعین تھیں اور تیرہ مارچ کو رات سات بجے کے قریب مجھے معلوم ہوا کہ کورونا وائرس کے باعث بے شمار پابندیاں عائد ہو چکی ہیں اور ان میں شادی ہال بھی شامل ہیں۔ بلاشبہ یہ خبر ایک ناگہانی آفت تھی۔ گھر میں ہر کوئی سخت پریشان ہو گیا۔

میں نے عشاء کی نماز میں اللہ سے دعا کی اے پروردگار تو گواہ ہے جس دن صبا کی شادی سے فارغ ہوا تھا، اس دن کے بعد سے شاید ہی کوئی دن ایسا گیا ہو کہ رجا کے اس دن کے لیے دعا نہ کی ہو، بس اپنا کرم فرمانا، خیر کا معاملہ کرنا۔ دعا کے بعد یہ ذہن بنایا کہ جیسے بھی ہو، رخصتی ملتوی نہیں کی جائے گی۔ گھر پہنچا تو سب کے چہروں پر سوال تھا کہ اب کیا ہو گا؟ سب بھائی بہن اپنی فیملیز سمیت تشریف لا چکے تھے اور اب بے یقینی کی صورت حال سے دوچار تھے۔

مگر یہ کیفیت وقتی ثابت ہوئی۔ شیخ ظہیر صاحب کو ان کے داماد عدنان صاحب نے یقین دہانی کرا دی تھی کسی بھی انتہائی صورت حال سے نمٹنے کے لیے تقریب ان کے گھر میں منتقل کر دی جائے گی جو ہال کے بالکل قریب ہی ہے۔ یوں قانون کی پابندی بھی ہو گی اور تقریب بھی۔ ہم نے اپنے طور پر یہ فیصلہ بھی کیا کہ مہمانوں میں ممکن حد تک کمی کر دی جائے تاکہ اجتماع کم سے کم ہو۔ اور ایسا ہی ہوا۔ اللہ کا شکر ہے کہ تقریب پورے وقار اور اہتمام سے منعقد ہوئی۔ بلاشبہ یہ عدنان صاحب کی خصوصی توجہ اور نگرانی سے سب کچھ بہترین طریقے سے ممکن ہوا۔ اور اللہ نے ایک اہم فریضے کی احسن طریقے سے انجام دہی کی توفیق دی۔

رجا اپنے مزاج میں صبا سے اگرچہ مختلف ہے لیکن دونوں میں قدرے مشترک ہے کہ وہ اپنے فیصلے جذبات کے بجائے دماغ سے کرتی ہیں۔ اختلاف رائے کو برداشت کرتی ہیں۔ مجھے کامل امید ہے کہ یہ عادت اور مزاج ایک کامیاب اور خوشگوار ازدواجی زندگی کی بنیاد بنے گا۔ پھر دونوں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور تعلیم ہنر ہی نہیں، اخلاقی تربیت بھی ہوتی ہے۔ اور یہ اخلاقی تربیت وہی کردار ادا کرتی ہے جو دیوار پر رنگ و روغن، لباس پر سجاوٹ و بناوٹ اور چہرے پر بناؤ سنگھار ادا

کرتا ہے۔ ان کی ڈگریاں تو ان کی فائل میں لگی رہیں گی مگر صرف ان کا رویہ اور رہنے سہنے کا سلیقہ بتائے گا کہ وہ کتنے پڑھے لکھے اور کس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔

زندگی کے اس اہم ترین موقعے پر ہر دولہا دلہن کی خواہش ہوتی ہے کہ اسے یادگار بنایا جائے لیکن کورونا وائرس کی وبا نے اس خواہش پر کئی قدغنیں لگادی ہیں۔

زندگی اسی کا نام ہے۔ یہی مواقع ہوتے ہیں کہ انسان کو یہ پیغام ملتا ہے کہ وہ بااختیار ہونے کے باوجود بھی کتنا بے اختیار ہے۔ میاں بیوی کو بھی یہ سوچنا چاہیے ان کے اختیار کے راستے میں بھی معاشرے کی بنائی ہوئی کئی جائز اور ناجائز رکاوٹیں در آتی ہیں۔ عقل مند ہیں وہ جو، ان ناگوار دیواروں اور رکاوٹوں سے سر پھوڑنے کے بجائے ان کا صبر اور حکمت سے سامنا کرتے ہیں۔

اس موقع پر رجا اور ولید کو یہ بات ضرور سامنے رکھنی چاہیے کہ کتنے ہی دولہا دلہن ہوں گے جن کی شادیاں شدید بدمزگیوں کا شکار ہوئی ہوں گی لیکن وہ کتنے خوش قسمت ہیں کہ وہ کم سے کم اس سے متاثر ہوئے ورنہ اگر وہ ایک دو ہفتے پہلے میاں بیوی ہوتے تو اور کسی سفر میں ہوتے تو کس قدر مشکل میں ہوتے۔ انھیں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ وہ کسی مشکل اور ہنگامی صورت حال سے دوچار نہیں ہوئے۔

دعا ہے کہ اللہ انھیں مستقبل میں بھی ہر ناگوار صورت حال سے محفوظ رکھے اور ان کا دامن خوشیوں سے ہمیشہ بھرا رہے۔

(رجا اور اس کے شوہر اس وقت جرمنی میں اپنی ہی فیلڈ میں کامیابی سے کام کر رہے ہیں۔ الحمدللہ)

فابیہ احسان

خاندانی معاملات میں ریاست کی مداخلت

انسان میں جبلی تقاضوں (بھوک، پیاس، خوف، محبت) کی طرح اخلاقی شعور یعنی خیر و شر بھی الہام کر دیے گئے ہیں۔

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا (سورہ الشمس:8)

یہی وجہ ہے کہ انسانی شخصیت سے جبلی تقاضے اور اخلاقی رویے (نیکی و بدی) تاعمر ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ انسان کا امتحان ہی یہی ہے کہ وہ جبلی تقاضوں کی تسکین کے لیے اپنے شعور میں الہام شدہ نیکی و بدی میں سے کس کا انتخاب کرتا ہے۔

الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (الملک:2)

جبلی تقاضے بہت زور آور ہوتے ہیں لہذا اللہ تعالی نے جو دین انسانوں کو دیا ہے اس میں اس بات کا پورا اہتمام کیا ہے کہ فرد کی ذات سے لے کر انسانی معاشرے میں ہر ہر سطح پر ایک ایسی قوت ضرور موجود ہو جو برائی کے سر اٹھانے پر حرکت میں آئے اور بزور اسے روک دے۔

فرد کی سطح پر

پہلے مرحلے میں انسان کے اندر ہی اچھائی برائی کے مابین فتوی لگانے والی قوت ضمیر کی شکل میں الہام کر دی ہے یہی وجہ ہے کہ دنیا کے ہر دور میں کسی بھی مذہب سے تعلق رکھنے والا شخص جھوٹ کو برا اور سچ کو اچھا قرار دیتا ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے امتحان کے پیش نظر انسان کو اختیار کرنے کی آزادی عطا کی ہے لہذا وہ اس آزادی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے

ضمیر کے فتوے کو اَن سُنا کر کے من مانی کر جاتا ہے۔ چنانچہ باطنی قوت کے آگے سرِ اطاعت نہ جھکانے والوں کے لیے دوسرے مرحلے میں خارج سے روک لگانے والی قوتوں کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔

معاشرے کی سطح پر

اسلامی تہذیب و معاشرت کی بقا تین بنیادی عناصر پر ہے:

(1) حفظ فروج

(2) حفظ مراتب

(3) امر بالمعروف و نہی عن المنکر

ان میں سے آخری دو اسی خارجی قوت کے طور پر کام کرتے ہیں جو فرد کی آوارہ منشی پر روک لگائے۔

حفظ مراتب

انسانی معاشرت مختلف اداروں پر مشتمل ہوتی ہے مثلاً خاندان کا ادارہ، تعلیمی ادارے، کاروباری مراکز، ریاست کا ادارہ وغیرہ۔ ان اداروں کے افراد کے مابین مراتب کا جو فرق ہے دین اسلام اُسی کا لحاظ برقرار رکھنے کے لیے یہ اجازت دیتا ہے کہ اولاد کی غلطی پر سرزنش کے لیے والدین، بیوی کی سرکشی پر تادیب کے لیے شوہر، شاگرد کی من مانی کو روکنے کے لیے استاد اور عوام الناس کو اپنے دائرے میں رکھنے کے لیے ریاستی ادارے حرکت میں آئیں۔

سربراہان خاندان کا یہ حق قرآن ان آیات میں بیان کرتا ہے (سورہ التحریم:6) (سورہ النساء:34)

ریاست کا یہ حق قرآن یوں واضح کرتا ہے کہ انسانی جان، مال، عزت کو حرمت حاصل ہے چنانچہ ان کی حدود کو پھلانگنے والے پر قصاص، دیت، قطع ید، کوڑوں یا دیگر سزاؤں کا نفاذ ریاست کی ذمہ داریوں کے دائرے میں آتا ہے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر

اسلامی معاشرے میں برائی کے سدّباب کے لیے ہر فرد پر لازم قرار دیا گیا ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش میں برائی دیکھ کر خاموش تماشائی نہ بنا رہے بلکہ برائی کے مرتکب کو تنبیہ کرے۔ رسول اللہ نے اسی بات کو مزید کھولتے ہوئے تین درجات مقرر کیے:

ہاتھ سے روکنا، زبان سے روکنا، دل میں برا جاننا (صحیح مسلم: 49)

یہ تین درجات فرد کے حالات اور استطاعت کی بنا پر ہیں۔

ہاتھ سے روکنے کی صلاحیت و استعداد ظاہری بات ہے ریاست میں امن و امان قائم رکھنے والے ادارے کو حاصل ہوتی ہے، ہمارے ہاں پولیس کا ادارہ یہ خدمات سرانجام دیتا ہے۔

زبان سے تنبیہ کرنے یا توجہ دلانے کا کام ہر شخص روزمرہ معاملات میں چھوٹے، بڑے کی قید سے بالاتر ہو کے کر سکتا ہے۔ عین ممکن ہے دن کے شروع میں بڑا بھائی، چچا اپنے چھوٹے بھائی، بھتیجے کو تلقین کرے اور دن کے آخر میں کسی بات پر چھوٹا اپنے سے بڑے اجنبی، سگے کو صحیح بات کی طرف توجہ دلائے۔ انسان بیشتر برائیاں محض اس وجہ سے بھی نہیں کرتا کہ وہ معاشرے میں اپنی ساکھ کو چوٹ پڑتے نہیں دیکھ سکتا۔ فوری متنبہ کرنے والے ماحول میں بھی برائی نہیں پنپتی۔ بنی اسرائیل پر لعنت کی وجہ یہی قرار دی گئی کہ انہوں نے ایک دوسرے کو برائی سے روکنا چھوڑ دیا تھا (المائدہ: 79،78)

یہ تنبیہ جن آداب میں کی جائے گی اسے بھی قران نے بیان کیا:

وقولوا للناس حسنا (البقرہ: 83)

مولانا امین احسن اصلاحی اس کی وضاحت یوں کرتے ہیں کہ تلقین و نصیحت کی بات شریفانہ انداز میں کی جائے ورنہ انسان گرد و پیش میں لوگوں کے حقوق کی ادائیگی ٹھیک سے نہ کر پائے گا اور مخاطب کا دل بھی دکھے گا یوں بات اس کے دل میں گھر کرنے کا سرے سے امکان ہی باقی نہ رہے گا۔

دل میں برا جاننے کا عمل اس کے لیے ہے جو کسی ماحول میں مجبورِ محض ہو اور اسکی بات کا دوسروں پر کوئی مثبت اثر ہونا تو دور کی بات خود اس کے لیے مشکلات میں مزید اضافہ کر دے، وہاں مصلحت کے پیش نظر انسان کے لیے اتنا بھی کافی ہے کہ وہ خود اس برائی سے نفرت کرتے ہوئے دور رہے۔

ریاست کی سطح پر

انسان کو صحیح روش پر رکھنے اور اس کے شر سے خود اس کو اور گرد و پیش کو محفوظ رکھنے کے لیے اللہ تعالی نے جہاں ضمیر کی عدالت کی صورت میں خودکار الارم سسٹم الہام کر دیا، جہاں پیغمبروں اور آسمانی کتب کی تعلیم کی صورت میں لائف

ٹائم ریمائنڈر سیٹ کر دیا اور جہاں معاشرے میں ہر فرد کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا ٹکٹ دے کر ہوشیار باز کر دیا تاکہ آنکھ ناک کان بند کر کے لاتعلق ہو کے نہ جئیں، وہاں کا احوال تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ:

"سب ٹھیک ہے"

مگر ہم بخوبی واقف ہیں کہ انسان کی آزاد منش طبیعت ان سب رکاوٹوں کو پھلانگ کر من مانی و سرکشی پھر بھی کر گزرتی ہے۔ قتل و غارت گری، ڈکیتی، کاروبار میں غبن، عورتوں کی عصمت دری، ریاست کے خلاف بغاوت جیسے رویے انسان کی اسی آزاد منش طبیعت کی بدولت ہی سامنے آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں بھلے وہ قبائلی طرز کی سادہ ترین ریاستیں ہوں یا متمدن ملوکی ریاستیں یا پھر آج کی جدید قومی ریاستیں ہوں، ہر نظام میں ایسے مجرمانہ افعال کے لیے سزائیں مقرر کی گئی ہیں۔ لہذا جب فرد اپنے ضمیر، دین کی تعلیمات اور معاشرتی رکاوٹوں سے صرف نظر کر کے جرم کر گزرے تو پھر ریاست کو پورا حق حاصل ہے کہ وہ تادیبی کارروائی کرے اور یہ حق ریاست کو خود ہمارے دین نے دیا ہے۔

نجی معاملات میں ریاستی مداخلت کا مقام

یہ بات تو شریعت سے واضح ہے کہ حدود کا نفاذ ریاست کے ذمے ہے، عوام الناس قانون ہاتھ میں نہیں لے سکتی۔ گھر، خاندان کی سطح پر بھی بعض اوقات ایسی نوبت آجاتی ہے جب ریاست کی مداخلت ناگزیر ہو جائے۔ وہ معاملات جو قضیے (متنازع مسئلے) کی شکل اختیار کر لیں اور خاندان کا ادارہ فرد کو تحفظ فراہم کرنے یا معاملہ سلجھانے میں ناکامی کا شکار ہو یا پھر خاموش تماشائی بن کر ظالم کو من مانی کے لیے معاون ماحول فراہم کرے ایسے میں مظلوم کا ریاست سے مدد طلب کرنا عین شرعی حق ہے۔ انسانی جان و مال کو اس کے کنبے قبیلے سے قربت و رسائی کے باعث سب سے زیادہ نقصان پہنچنے کا امکان ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالی نے اپنی شریعت میں نسبی و سسرالی رشتوں کے مابین ظلم و زیادتی کو روکنے کے لیے وراثتی تقسیم خود کر دی، نکاح و طلاق کے معاملات میں مفصل رہنمائی فرمائی، حیا کے تقاضوں کے تحت سورہ النور میں ملنے جلنے کے آداب مقرر کر دیے۔ ان سب اقدام کے باوجود فرد پر ظلم و زیادتی کی صورت میں شریعت نے خاندان کے ادارے کے سربراہان کو ہی یہ ذمہ داری دی کہ پہلے مرحلے میں وہی قضیہ سلجھائیں۔ مثلا طلاق کے معاملے میں فیصلہ سازی کے لیے دو طرفہ حَکَم بٹھانا اسی کی ایک صورت ہے مگر ہم روزمرہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ خاندان کا ادارہ فرد کو

انصاف دلانے میں ناکام رہتا ہے مظلوم ہی کو خاموش رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ ایسے میں مظلوم کا برتر قوت (ریاست) کی جانب انصاف کے لیے رجوع کرنا شرعی حق ہے۔

سیرت نبوی سے مثالیں

مدینہ میں قبائلی طرز کی ریاستی انتظامیہ کے اندر لوگ اپنے گھریلو یا کاروباری نوعیت کے قضیے رسول اللہ کی خدمت میں حل کے لیے پیش کرتے۔

ثابت بن قیس کی اہلیہ خلع کا کیس لے کر آئیں۔

ایک لڑکی کے بچپن میں اس کے والد نے نکاح کر دیا تھا۔ وہ لڑکی رخصتی کی عمر میں پہنچی تو نکاح کی عدم پسندیدگی کا قضیہ لے کر آئی۔

عبداللہ بن عمر نے قرآن میں مقرر کردہ طریقہ طلاق سے انحراف کرتے ہوئے بیوی کو طلاق دی جسے ان کے والد سیدنا عمر بن خطاب نے رسول کی خدمت میں پیش کیا۔

ایسی کئی مثالیں سیرت نبوی سے ملتی ہیں جس میں خاندان جب اپنے تئیں معاملہ حل نہ کر پاتا تو افراد خانہ ریاستی عدالت میں منصفانہ فیصلہ طلب کرتے۔

انصاف کے قیام میں معاشرتی کوتاہی کی مثالیں

نومولود لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا، ستی کی رسم میں بیوہ کو زندہ جلا دینا، کاروکاری کی رسم میں محض گمان، شک کی بنا پر لڑکا لڑکی کو قتل کرنا، بعض کیسز میں تو محض پسند کی شادی پر کاروکاری کرنا، یہ سب کون کرتے ہیں؟ گھر خاندان کے افراد ہی ہوتے ہیں جو اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کرتے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں عورت کو وراثت میں حصہ دینے سے آج تک گریز کا رویہ اپنایا گیا ہے۔

ایسی تمام ظلم و بربریت پر مبنی رسمیں جو سالہا سال بطور رواج خاندانوں میں جاری رہتی ہیں بھلا کس کے دم پر؟ انہی کے دم پر جو خاندان قبیلوں میں صاحب اختیار ہیں۔ لہذا ہر صاحب اختیار کے اوپر کوئی قوت ضرور ہونی چاہیے جو اختیارات کے ناجائز استعمال کو زور بازو روک دے اور افراد کی جان، مال اور عزت کو تحفظ فراہم کرے۔

The Domestic Violence (Prevention & Protection) Act, 2026

معاشرت

جنوری 2026 میں پارلیمنٹ نے گھریلو تشدد سے حفاظت کا بل پاس کیا جسے معاشرے میں حمایت کے ساتھ ساتھ شدید تنقید کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ بطور مسلمان ہم سب کا ایمان ہے اور مشاہدہ بھی کہ امتحان کی غرض سے اللہ تعالی نے اس دنیا کی ہر شے میں دو پہلو (مثبت و منفی) رکھے ہیں. سب سے بڑی مثال تو خود ہمارے ہاتھ کی ہے جو ایک بڑی نعمت ہے مگر یہی ہاتھ جب قتل یا چوری کرے تو زحمت بھی بن جاتا ہے۔

لہٰذا ہر نئی سامنے آنے والی چیز پر فوراً منفی پراپیگنڈا کرنے کے بجائے بغور تجزیہ کر کے جاننا چاہیئے کہ اس میں وہ کون سے پہلو ہیں جو ہمارے لیے بھرپور نفع مند ہیں اور کن پہلوؤں سے اس چیز کا استعمال ضرر رساں ثابت ہو گا۔

ہمارے تبصرہ نگاروں، دانشوروں کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ ٹی وی اور سوشل میڈیا پلیٹ فارمز پر عوام الناس میں ایسی چیزوں کا مفصل تجزیہ پیش کر کے شعوری بیداری اجاگر کریں۔ سطحی نوعیت کے جذباتی تبصرے عوام الناس میں کسی چیز یا معاملے کے متعلق کبھی دور اندیشی پیدا نہیں کرتے۔

اگرچہ اس ایکٹ پر سیر حاصل گفتگو ہو سکتی ہے مگر طوالت کے خدشے سے چند غور طلب نکات دیکھتے ہیں۔

1- یہ ایکٹ جن متاثرین کے لیے بنایا گیا اس فہرست میں صرف خواتین نہ تھیں بلکہ وہ تمام افراد گنوائے گئے جن کی کمزوری کے باعث خاندان میں ان کے حقوق سلب کر لیے جانے کا امکان ہوتا ہے یعنی بچے، بوڑھے، مرد، معذور، مخنث۔ لیکن مجھے جن گنتی کے معروف تبصرہ نگاروں کو سننے کا اتفاق ہوا انہوں نے اس اقدام کو خالصتاً عورتوں کو فیمی نزم کی تحریک کے زیر اثر گھر بار سے آزاد کر کے خود مختار بنانے کا ایجنڈا قرار دیا۔

یہاں کچھ سوالات پیدا ہوتے ہیں:

کیا ہمارے شہروں دیہاتوں میں عورتوں پر تشدد، جلانے، ان کا مال ہڑپ جانے کے واقعات نہیں ہوتے؟

کیا ایسے کیسز سے ہم اپنے خاندانوں میں بالکل واقف نہیں ہے جہاں لڑکیوں کو خاندان کے اندر مرد (کزن یا دیگر رشتہ دار) ہراساں کرتے ہیں مگر تحفظ کی ضمانت ملنے کی امید تو نہیں ہوتی البتہ خاندان میں تماشا بن جانے اور زندگی بھر کی بدنامی کے خوف سے لوگ خاندان کے سربراہان سے بھی معاملے کا نوٹس لینے کی درخواست نہیں کرتے؟

کیا جدید تہذیب کے زیر اثر لڑکیاں اب بوڑھے ساس سسر سے نالاں ہو کر ناروا سلوک نہیں کرتیں جبکہ انہی کی بدولت ہی وہ شوہر جیسی نعمت سے فیض یاب ہوتی ہیں؟

کیا ہمارے ہاں شوہر کی کمائی کھانے، گھر برتنے اور اس کے نام کا تاج پہن کر خاندان بھر میں سر اٹھا کر چلنے والی عورت جائیداد کی تقسیم یا سسرال سے ناچاقی کی بنا پر اپنے ہی شوہر کے لیے ایسے حالات پیدا نہیں کر دیتی کہ وہ ڈپریشن یا کسی

بڑے مرض کا شکار ہو جاتا ہے اور بعض کیسز میں تو اسی چپقلش کے ماحول میں گھٹ گھٹ کر جیتے ہوئے جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے؟

ایسے لوگ اول تو کسی کو مدد کے لیے پکارتے نہیں لیکن اگر اتفاقاً سوال کر بیٹھیں تو لوگ یہی سوچ کر کترا جاتے:

"تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو"

کیا ہمارے معاشرے میں بچوں سے جنسی عمل کئی کئی سال جاری رکھنے کے معاملات بالکل نہیں ہوتے؟

ڈیلی پاکستان نیوز دسمبر 2020 میں سارہ یونس کی رپورٹ بتاتی ہے کہ اس سال بچوں سے جنسی عمل کے رپورٹ ہونے والے 1304 کیسز میں 822 بچے وہ تھے جن سے زیادتی میں ان کے رشتہ دار ہی ملوث تھے۔ صرف 135 کیسز میں اجنبی لوگ مجرم تھے۔

کیوں؟ اس لیے کہ خاندان میں قربت کی بنا پر رسائی با آسانی میسر ہوتی ہے۔ سارہ یونس کا کہنا ہے کہ رپورٹ میں نہ آنے والے کیسز کی تعداد تو بہت بڑی ہے جس کی ایک وجہ تو یہ کہ لوگ دبا دیتے اور دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ والدین سِرے سے واقف ہی نہیں ہوتے۔ گھر خاندان بھلے ان کیسز کو دبانے میں برسوں سے کامیاب رہے مگر آخر کب تک!!!!!! ایک وقت آتا ہے کہ جب بیماری کے وجود کا ہی منکر ہو کر علاج کی کوشش نہ کی جائے تو وہ منہ سِر اٹھا کر سامنے آجاتی ہے اور تب تسلیم کیے بنا چارہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ سوشل میڈیا نے ٹرک اڈوں، مدارس، ہوسٹلز، اسکولز میں ایسے کیسز کی بھرمار کا پول کھول دیا۔

بات دباتے اور چپ سادھتے وقت لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ امت مسلمہ پر امر بالمعروف و نہی عن المنکر بطور فریضہ عائد کیا گیا ہے۔ فرمان رسول ہے:

"اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم ضرور معروف کا حکم دو اور منکر سے روکو! ورنہ قریب ہے کہ تم اللہ سے دعا کرو اور تمہاری دعا قبول نہ کی جائے۔" (جامع ترمذی: 2169)

پھر بھی کوئی اعتراض کر سکتا ہے کہ لوگ قانون کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں تو سوال یہ ہے کہ آج تک ایسا کون سا قانون ہے جس کا ناجائز فائدہ نہ اٹھایا گیا ہو، خود رسول اللہ نے اپنے بشری عجز کا حوالہ دیتے ہوئے عدالتی فیصلہ کسی چرب زبان کے حق میں کر دینے کے پورے امکان کا اعتراف کیا۔

"میں تو بس ایک انسان ہوں۔ تم میرے پاس اپنے جھگڑے (قضیے) لاتے ہو، اور ہو سکتا ہے کہ تم میں سے کوئی اپنے مد مقابل کی نسبت زیادہ چرب زبان (دلیل پیش کرنے میں ماہر) ہو، اور میں اس کی چکنی چپڑی باتیں سن کر فیصلہ کر دوں۔

تو یاد رکھو! اگر میں اسے اس کے بھائی کا حق دے دوں، تو وہ اسے ہر گز نہ لے، کیونکہ (در حقیقت) میں اسے آگ کا ایک ٹکڑا کاٹ کر دے رہا ہوں۔" (بخاری:2680)

تو کیا قانون بنانا چھوڑ دیا جائے؟

نہیں! بلکہ عوام الناس کی تربیت کی جائے کہ کسی سہولت کا ناجائز فائدہ نہ اٹھایا جائے۔

میرے نزدیک خاندان کے ادارے میں ذمہ داران کو قرآن و سنت کی روشنی میں قضیے سلجھانے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیئے یہ ان کا فریضہ ہے لہذا وہ اس سے اعراض نہیں برت سکتے، یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہماری نسلوں کا ذمہ داران پر بھروسہ قائم رہے اور وہ پر اعتماد ہو کر انکی جانب رجوع کریں۔ پھر ایسی صورت حال بہت کم پیدا ہو گی جب تمام کوششیں بے سود جائیں اور ریاستی مدد کی جانب رجوع کرنا پڑے۔

جس طرح کیمرے کی آنکھ بہت حد تک لوگوں کو محتاط رویہ اپنانے پر مجبور کر دیتی ہے ویسے ہی اس ایکٹ کا صحیح استعمال اگر ہمارے معاشرے میں مروج ہوا تو افراد کے لیے بڑی لگام ثابت ہو گا کیونکہ ہر شخص اپنے معاشرتی امیج کے بارے میں بہت محتاط ہوتا ہے۔

گویا گھوم گھما کر پھر وہی حقیقت ہمارے سامنے آگئی:

"انسان بہت سی برائیاں محض معاشرے کا سامنا کرنے کے خدشے سے ترک کر دیتا ہے۔"

اس لیے دین اسلام نے ہر مسلمان پر گرد و پیش میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنا بطور فریضہ عائد کیا ہے۔

عائشہ کلیم

شادی: ایک نعمت

شادی کو ہمیشہ سے دنیا بھر کی تمام تہذیبوں، مذاہب اور معاشروں میں محبت، خلوص اور باہمی نگہداشت کے ایک مقدس رشتے کے طور پر دیکھا جاتا رہا ہے۔ جب سے انسان اس زمین پر آباد ہوا ہے، یہ تعلق انسانی زندگی کا ایک لازمی حصہ رہا ہے۔ اگرچہ ہر معاشرے میں شادی اپنے مخصوص رسم و رواج، اقدار، روایات اور مذہبی عقائد کے مطابق انجام پاتی ہے، اسی لیے نکاح کے طریقۂ کار اور قوانین میں بھی نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔ ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ وہ افراد جو اپنے اصل معاشرے سے دور، کسی دوسرے ملک میں ملازمت یا خاندانی ذمہ داریوں کے باعث مقیم ہوتے ہیں، ان کے لیے شادی کے انداز اور ترجیحات مختلف ہو جاتی ہیں۔ اس حوالے سے دریا کو کوزے میں بند کرتی ایک موثر تحریر

طارق ایک معزز اور تعلیم یافتہ گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی پرورش اعلیٰ اخلاقی اقدار کے ساتھ ہوئی تھی۔ جب اس نے اپنے کیریئر میں استحکام حاصل کیا تو اس نے اپنے والدین سے درخواست کی کہ اب اس کے لیے ایک مناسب جیون ساتھی کی تلاش شروع کی جائے۔ والدین اس کی اس خواہش پر خوش ہوئے، مگر ساتھ ہی انہوں نے طارق کو مشورہ دیا کہ وہ خود بھی اپنی ترجیحات کے مطابق تلاش جاری رکھے۔ یوں اس جستجو کا آغاز ہوا۔

طارق اور اس کے اہلِ خانہ مختلف گھروں میں لڑکیوں سے ملنے گئے، مگر نتائج حیران کن بلکہ توقعات سے بالکل مختلف نکلے۔ کچھ لڑکیوں نے فخر سے یہ بات کہی کہ انہیں گھریلو امور، خصوصاً باورچی خانے کے کاموں کا کوئی تجربہ نہ تو ہے اور

نہ ہی وہ ان میں دلچسپی رکھتی ہیں، چاہے یہ روزمرہ زندگی کا حصہ ہی کیوں نہ ہوں۔ بعض نے ملنے سے انکار کر دیا، جبکہ کئی نے واضح طور پر یہ ترجیح دی کہ وہ شادی کے بجائے اپنے کیریئر کو اہمیت دیتی ہیں۔ یوں طارق کی تمام کوششیں بے نتیجہ ثابت ہوئیں۔

آخر کار طارق نے اپنی تلاش کا دائرہ وسیع کرنے کا فیصلہ کیا اور سوشل میڈیا کا سہارا بھی لیا۔ مگر بیشتر پلیٹ فارمز دراصل ڈیٹنگ سائٹس کی شکل اختیار کر چکے تھے، جبکہ طارق کا مقصد صرف اور صرف شادی تھا، نہ کہ وقتی تعلقات۔ اس کے باوجود اس نے ہمت نہیں ہاری اور اپنی کوشش جاری رکھی۔

شادی زندگی کا ایک نہایت اہم رشتہ ہے، اسی لیے درست جیون ساتھی کا انتخاب ایک بڑا چیلنج بن چکا ہے۔ جدید دور کے رجحانات کافی مختلف ہو چکے ہیں اور دونوں جنسوں کو مناسب شریکِ حیات کی تلاش میں مشکلات کا سامنا ہے۔ اگرچہ میرج بیوروز، آن لائن میٹرومونی سائٹس اور دیگر ذرائع موجود ہیں، مگر اس کے باوجود یہ عمل آسان نہیں۔ آن لائن رشتوں کی تلاش بظاہر سہل معلوم ہوتی ہے، مگر اس میں دھوکا دہی کے امکانات بھی موجود رہتے ہیں، اور بعض اوقات اس کے نتائج خطرناک بھی ہو سکتے ہیں۔ اس لیے اسے مکمل طور پر قابلِ اعتماد نہیں کہا جا سکتا۔

بلاشبہ، ہر تعلق اپنے ساتھ کچھ پیچیدگیاں لے کر آتا ہے۔ اکثر افراد اپنے شریکِ حیات کے بارے میں غیر یقینی کا شکار رہتے ہیں، جس کے باعث باہمی اعتماد قائم نہیں ہو پاتا۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سی شادیاں جلد ہی اختلافات کا شکار ہو کر علیحدگی یا طلاق پر منتج ہو جاتی ہیں۔

ازدواجی رشتہ دراصل مشترکہ ذمہ داری، باہمی احترام، سمجھ بوجھ، ذہنی ہم آہنگی اور مشکل حالات میں ایک دوسرے کی عزت و وقار کے تحفظ کا نام ہے۔ افسوس کہ ایسے تعلیمی یا تربیتی ادارے بہت کم ہیں جو شادی کے لیے تیار نوجوانوں کی رہنمائی کریں۔ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ مؤثر ازدواجی مشاورت (کاؤنسلنگ) فراہم کی جائے تاکہ مستقبل کے میاں بیوی کو بہتر انداز میں رہنمائی مل سکے۔ مزید برآں، نوعمر لڑکوں اور لڑکیوں کو شادی کے تصور، اس کی ذمہ داریوں اور ناکام ازدواجی زندگی کے سنگین نتائج سے آگاہ کرنا بھی نہایت ضروری ہے۔

شادی دراصل ایک مقدس بندھن اور میاں بیوی کے درمیان ایک باقاعدہ معاہدہ ہے۔ اس حوالے سے والدین کا کردار انتہائی اہم ہے کہ وہ اپنے بچوں کی درست رہنمائی کریں اور انہیں اس رشتے کی اہمیت سے آگاہ کریں۔ شادی کے بندھن سے پہلے اس کی تعلیم دینا والدین کا نہایت ضروری فریضہ ہے۔ اسی طرح تعلیمی اداروں کو بھی چاہیے کہ وہ نئی نسل کو شادی کی اہمیت اور اس کے معاشرتی اثرات سے روشناس کروائیں، کیونکہ شادی ہی انسانی معاشرے اور ثقافت کی بنیادی اکائی ہے۔

والدین کو چاہیے کہ وہ اپنی ازدواجی زندگی کو ایک مثبت مثال کے طور پر پیش کریں تاکہ بچوں کے دل میں شادی کے بارے میں اعتماد پیدا ہو۔ گھریلو مسائل کو بچوں کے سامنے زیرِ بحث لانے کے بجائے باہمی طور پر حل کرنا چاہیے، تاکہ بچوں کے ذہن میں الجھن یا منفی تاثر پیدا نہ ہو۔

لہٰذہ چاہے وہ طارق ہو یا کوئی طاہرہ، جب لڑکا لڑکی شعور کی عمر کو پہنچ جائیں تو ان کو اپنا جیون ساتھی تلاش کرنے میں اولین فریضۃ ان کے والدین کا ہے۔ وہ اس سلسلے میں اپنے اولاد کی پسند، طبیعت، مزاج اور طبی مسائل کو سامنے رکھتے ہوئے ان کی مدد کریں۔ وہ اپنے تجربے سے ان کو مشورہ ضرور دیں لیکن اپنے فیصلے ٹھونسنے سے پرہیز کریں۔

شادی ایک مضبوط اور صحت مند خاندان ہر معاشرے کی ریڑھ کی ہڈی ہوتا ہے۔ اس لیے ہم سب کی ذمہ داری ہے کہ ہم ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیں جو باہمی اعتماد، محبت اور خلوص سے بھرپور ہو—چاہے وہ رشتہ خاندان، قبیلے اور برادری کے اندر ہو یا اس کے باہر۔

کلثوم ثاقب

صبر جمیل کیا ہے؟

اس مضمون میں مصنفہ نے قرآن مجید میں انبیاء علیہم السلام کے واقعات کو اپنے غور و فکر کا محور بنایا ہے۔ پھر ان قصص میں صبر جمیل کے تصور کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ مصنفہ نے اس فہم کا ہمارے روزمرہ مسائل پر بہت خوب صورتی سے اطلاق کیا ہے۔

تاریخ جتنا اہم موضوع ہے، لوگ اتنے ہی اس سے بیزار دکھائی دیتے ہیں۔ جیسے جیسے میری عمر بڑھتی جارہی ہے، مجھے شدت سے اس بات کا احساس ہوتا جارہا ہے کہ مسلمان، بحیثیتِ قوم، اپنی کسی روش اور اپنی تاریخ سے کچھ سیکھنے کے لیے تیار نہیں۔ معلوم نہیں یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔

آج دنیا میں جو ہنگامہ برپا ہے، وہ اپنے موضوع کے لحاظ سے کچھ نیا نہیں۔ کچھ کردار نئے ہیں، کچھ چہرے بدل گئے ہیں، مگر موضوع بھی وہی ہے اور جستجو بھی وہی۔ میں زیادہ پیچھے نہیں جاتی، اپنی نوجوانی ہی کے زمانے کو یاد کر لیتی ہوں۔ 9/11 میری یادداشت میں آج بھی پوری شدت کے ساتھ محفوظ ہے۔ کراچی میں بیٹھ کر میں نے ٹی وی پر وہ تمام نشریات دیکھی تھیں، اور پھر اس کے بعد آنے والے ہر دن میں جذباتی تقریریں، تحریریں، اخبارات کی چیخ و پکار، معصوم جانوں کا ضیاع — یہ سب کچھ میری یادداشت میں آج بھی پوری طرح نقش ہے۔

لیکن افسوس یہ ہے کہ نہ اُس وقت ایک عام مسلمان نے ہمت، استقامت، عقل، حوصلے اور صبر جمیل سے کام لیا، اور نہ ہی آج وہ اِن اوصاف کو اپنانے کے لیے تیار دکھائی دیتا ہے۔ وہ اپنی بے بسی کا رونا تو روتا ہے، لیکن ساتھ ہی جذباتیت، احساسِ کمتری، جلد بازی اور جہالت ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے بیٹھا ہے

اس وقت، نوجوانی کے زمانے میں، میں نے خود قرآن کو ترجمے کے ساتھ ایک بار بھی پوری طرح نہیں پڑھا تھا، لیکن اب پڑھ چکی ہوں۔ اسی لیے آج جب لوگ اپنی جذباتیت کے حق میں قرآن سے استدلال کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو میں انہیں یہ سمجھانا چاہتی ہوں کہ قرآن کو اپنی مرضی کے مطابق توڑ مروڑ کر نہ خود سمجھیں، اور نہ ہی لوگوں کے

سامنے اُسے اس انداز میں پیش کریں۔ جس قرآن کی چند آیات کو آپ اپنے استدلال کی بنیاد بنا کر پیش کرتے ہیں، اُس کے مقابلے میں پورا قرآن اپنے تمام انبیاء ورسل کی سرگزشت سے بھرا پڑا ہے، جہاں ہر جگہ صبر، ہمت اور استقامت ہی یعنی صبر جمیل جلوہ گر نظر آتا ہے

پھر وہ سرگزشت چاہے موسیٰ علیہ السلام کی ہو، لوط علیہ السلام کی، نوح علیہ السلام کی، صالح علیہ السلام کی، شعیب علیہ السلام کی، عیسیٰ علیہ السلام کی، یعقوب علیہ السلام کی یا یوسف علیہ السلام کی — کیا کوئی ہے جو ان واقعات پر غور و فکر کرے؟ کیا کوئی ہے جو تاریخ کے ان اسباق میں اپنے لیے رہنمائی تلاش کرے؟

لفظ 'صبر جمیل' کا مطلب یہ نہیں کہ انسان بغیر ہمت، حوصلے اور کوشش کے محض اپنی جگہ بیٹھا رہے، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنے عزم، ہمت اور حوصلے کو ہمیشہ سربلند رکھے، اور حالات کو بہتر بنانے کے لیے جو کچھ بہتر طریقے سے کر سکتا ہو، اُسے بغیر مایوس ہوئے مسلسل کرتا رہے۔

کیا یعقوب علیہ السلام کے شایانِ شان یہ تھا کہ وہ اُسی اولاد کے ساتھ رہتے رہیں جس کے بارے میں انہیں غالب گمان تھا کہ اُس نے یوسف علیہ السلام کو کہیں پھینک دیا ہے؟ وہ انہیں چھوڑ کر کیوں نہ چلے گئے؟ ایسے ظالم لوگوں کے ساتھ کیوں رہے؟ پھر انہی سے بنیامین کے بارے میں عہد کیوں لیا کہ وہ اُس کا خیال رکھیں گے۔

یہ وہی اولاد تھی جو بڑھاپے میں اپنے والد کو طعنہ دے رہی تھی کہ آپ تو یوسف کے غم میں خود کو ہلاک ہی کر ڈالیں گے، لیکن اپنے جرم کا اعتراف اُن کے سامنے نہیں کر رہی تھی۔ پھر یہی لوگ یوسف علیہ السلام کے سامنے الزام بھی لگاتے ہیں کہ 'اگر بنیامین نے چوری کی ہے تو یہ کچھ بعید نہیں، کیونکہ اس سے پہلے اس کے بھائی نے بھی چوری کی تھی۔' اللہ تعالیٰ نے نہ صرف یہ بات نقل کی، بلکہ ساتھ ہی قرآن میں یوسف علیہ السلام کے دل کی کیفیت بھی بیان کر دی کہ اس طعنے سے اُنہیں جو اذیت پہنچی، اُسے انہوں نے اپنے دل ہی میں رکھا اور ظاہر نہ کیا۔ یہ ایک نہایت باریک نکتہ ہے، جسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

یوسف علیہ السلام سچے بھی تھے، نبی بھی تھے، حق پر بھی تھے، اور اُس وقت صاحبِ اقتدار بھی تھے۔ وہ چاہتے تو منہ توڑ جواب دے سکتے تھے، اپنے اوپر ڈھائے گئے ہر ظلم کا بدلہ لینے کی پوری قدرت رکھتے تھے۔ اور بظاہر یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا اُنہیں ایسا کرنے کا حق حاصل نہ تھا؟ پھر آخر کون سی چیز تھی جس نے اُنہیں صبر، ہمت، عقل اور استقامت کے ساتھ معاملہ کرنے پر آمادہ رکھا۔

نقطہ نظر

میں سمجھتی ہوں کہ اس کا جواب 'صبر جمیل' ہی میں پوشیدہ ہے۔ پھر موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کی طرف دیکھیے۔ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ اُن سے ہم کلام ہے، مگر موسیٰ علیہ السلام یہ نہیں کہتے کہ بس اللہ میرے ساتھ ہے، لہٰذا مجھے فرعون کے ظلم اور اس کی قوت سے کیا ڈر۔ بلکہ وہ اپنے ذہن میں اٹھنے والے ہر خدشے کو اللہ کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ کیا وہ نہیں جانتے تھے کہ اللہ اُن کے دل و دماغ کی ہر سوچ سے واقف ہے؟ یقیناً جانتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ اے موسیٰ، میں نے تو اُس وقت بھی تم پر احسان کیا تھا جب تم ایک نومولود بچے تھے، اور تمہاری ماں کے دل میں یہ بات ڈالی تھی کہ تمہیں دریا میں ڈال دے، اور میں نے تم پر اپنی محبت کا ایسا پرتو ڈالا تھا کہ جو تمہارا دشمن تھا اور میرا بھی دشمن، وہی تمہیں پالنے پر مجبور ہو گیا۔ تو کیا اللہ اس بات پر قادر نہ تھا کہ آج بھی موسیٰ علیہ السلام پر اپنی محبت کا وہی پرتو ڈال دیتا، اُن کے گرد ایک اَن دیکھا حصار قائم کر دیتا، اور کہہ دیتا کہ اے موسیٰ، فکر نہ کرو، فرعون تمہیں چھو بھی نہیں سکے گا؟ مگر ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ اب موسیٰ علیہ السلام کو اپنی محنت، اپنی کوشش، اپنے صبر، اپنی ہمت اور اپنی استقامت سے راستہ بنانا تھا۔

ایسا کیوں نہ ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو جوش دلاتے، انہیں کہتے کہ اللہ تمہارے ساتھ ہے، تم بس فرعون سے ٹکرا جاؤ، جو پتھر ہاتھ آئے اُٹھا کر مار دو، اور اللہ تمہاری مدد کرے گا؟ موسیٰ علیہ السلام کی پوری سرگزشت میں ایک بہت بڑا سبق پوشیدہ ہے: اپنی تربیت کرو، اپنے آپ پر محنت کرو، اپنے گھر اور اپنے خاندان کی اصلاح کرو، اور جب خود کو کندن بنالو گے تو اللہ کی مدد کو اپنے قریب پاؤ گے۔

جس مسلمان قوم سے میں مخاطب ہوں، اُسے میں پاکستان میں بھی دیکھتی ہوں اور یہاں امریکہ میں بھی، کہ وہ مسجد میں اپنے جوتے تک قرینے سے اُتار کر نہیں رکھ سکتی۔ افطار کے کھانے کے لیے قطار بنتی ہے تو ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی بے چینی نمایاں نظر آتی ہے، جب تک کہ چند رضاکار سر پر کھڑے نہ ہوں۔ حالانکہ ان میں سے کوئی چار دن کا بھوکا نہیں ہوتا، نہ ہی ایسا ہوتا ہے کہ آخر میں جانے والے کو کھانا کم ملے گا یا نہیں ملے گا؛ مگر آدمی بعض اوقات اپنی عادت کا اسیر ہوتا ہے۔

یہ جذباتی نعرے لگانے والے، واٹس ایپ پر پیغامات پھیلانے والے، اور خود کو مظلوم ثابت کرنے والے، یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے گھر کے باہر کچرا پھینکتے، گاڑی چلاتے ہوئے بلاوجہ لوگوں سے بدزبانی کرتے اور فراوانی سے جھوٹ بولتے ہیں۔ کیا اِن کاموں کے لیے بھی انہیں یہود و نصاریٰ نے مجبور کیا ہے؟ رشوت لیے بغیر جن کا گزارا نہیں، کیا اس کا الزام بھی یہود و نصاریٰ پر ہے؟

یا پھر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سب کچھ آپ کر سکتے ہیں، لیکن چونکہ آپ اللہ کے لاڈلے ہیں، اس لیے اللہ کی سنت کے مطابق آپ پر کوئی حکم لاگو نہیں ہو گا؟ پھر ایسے سمجھنے والے اور بھی ہیں، جن کا یہی دعویٰ ہے کہ وہ بھی اللہ کے لاڈلے ہیں، اور وہ جو کچھ بھی کر لیں، اُن پر بھی اللہ کی سنت کے مطابق کوئی گرفت نہیں ہو گی۔

پس نتیجہ یہی ہے کہ اس معاملے کا فیصلہ ہو کر رہے گا، اور اللہ کے قانون کے مطابق ہی ہو گا۔ نہ آپ اس قانون کی گرفت سے باہر ہیں، نہ کوئی اور اللہ کی پکڑ سے باہر ہے

میری تمام باتوں کا حاصل یہ ہے کہ خدارا اپنے چلن میں تبدیلی پیدا کیجیے، اپنی تربیت کیجیے، اور اپنے آپ کو اس قابل بنائیے کہ جن رسولوں اور نبیوں کے آپ نام لیوا ہیں، اور جس قرآن کو اپنی کتاب مانتے اور جانتے ہیں، اُسے سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کریں۔ کسی بہکاوے میں نہ آیئے۔

اللہ کا قانون ہر قوم کو ایک مقررہ مدت تک مہلت دینے کا وعدہ کر چکا ہے، اور اللہ کا وعدہ سچا وعدہ ہے۔ اللہ قرآن میں بیان کرتا ہے کہ بہت سی قومیں اپنے ہی کرتوتوں کی بنا پر ہلاک ہوئیں۔ البتہ یونس علیہ السلام کی قوم وہ تھی جس نے عذاب آنے سے پہلے ہی اپنے چلن کو بدل لیا، توبہ کر لی، تو اللہ نے انہیں اپنی سرزمین میں رہنے اور بسنے کا موقع عطا فرمایا۔ ہر قوم کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔

تو کیا آپ آج قرآن کے اس پیغام کو سن کر خود کو بدلنے کے لیے تیار ہیں؟ اس فکر میں نہ پڑیے کہ اس میں تو بہت وقت لگے گا، یہ تو برسوں کا کام ہے، بھلا اس سے کیا ہو گا۔ یہ تمام حیلے اور بہانے شیطان دل میں ڈالتا ہے، اِن سے بچیے۔ اللہ کی سنت تبدیل نہیں ہوتی۔ آپ کو خود کو تبدیل کرنا ہے، اپنی تربیت کرنی ہے، اپنی سوچ، اپنی سمجھ، اپنے جذبات اور اپنے احساسات کو قرآن کی تعلیمات کے مطابق ڈھالنا ہے۔ اللہ آپ کا اور میرا حامی و ناصر ہو۔

افسانہ

نعیم احمد بلوچ

امید کا روشن دان

حضور ﷺ کے صاحب زادے "ابراہیم" کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا
تو امام مسلم کی صحیح میں ہے کہ ان کی والدہ سیدہ ماریہ قبطیہ کو
حضور ﷺ نے فرمایا:
''إِنَّ إِبْرَاهِيمَ ابْنِي مَاتَ صَغِيرًا، وَإِنَّ لَهُ مُرْضِعًا فِي الْجَنَّةِ''
یعنی ابراہیم کم عمری میں فوت ہوئے اور جنت میں ان کی پرورش ہو
رہی ہے۔ یہ افسانہ اسی سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔

وہ رات شہر کی سب راتوں سے مختلف تھی۔ آسمان پر چاند ایسے بے نور لٹکا ہوا تھا جیسے کسی غم زدہ آنکھ میں آخری نمی بچی رہ گئی ہو، اور ہوا میں ایسی سرد خاموشی تحلیل تھی کہ در و دیوار تک سانس روکے کھڑے معلوم ہوتے تھے۔ صحن کے بیچوں بیچ رکھا ہوا مٹی کا وہ ننھا سا گملا، جس میں کبھی ایک چھوٹا سا پودا کلیاں دینے کی ضد کیا کرتا تھا، اب سوکھا پڑا تھا؛ جیسے گھر کے ایک کمرے میں موت نے قدم رکھا ہو اور باقی تمام چیزوں سے بھی ان کی رونق چھین لی ہو۔

زہرہ—ایک ماں، مگر ایسی ماں جس کے ہاتھ کی لکیروں سے جیسے اس کا دس سالہ بیٹا اچانک مٹ گیا ہو۔ چند ہی روز پہلے تک اس گھر میں ایک آواز پھرکتی تھی: کبھی کتابوں کے ورق پلٹنے کی، کبھی دوڑتے قدموں کی، کبھی بے ساختہ سوالوں کی، کبھی ہنسی کی۔ اب ہر طرف ایک ایسا خلا تھا جو صرف سنائی نہیں دیتا تھا، محسوس بھی ہوتا تھا۔ دروازہ کھلتا تو لگتا شاید وہ دوڑتا ہوا آئے گا؛ باورچی خانے سے برتنوں کی آواز اٹھتی تو گمان ہوتا ابھی آ کر کہے گا، ''اماں، آج کھانے میں کیا ہے؟'' مگر کوئی نہ آتا۔ خاموشی کسی ظالم حقیقت کی طرح اس پر مسلط رہتی۔

افسانہ

ایان کی عمر ابھی دس برس کی ہی تو تھی—نہ چہرے کی معصوم روشنی میں کوئی تغیر آیا تھا، نہ آواز کے ساز میں کوئی بھاری پن اترنے پایا تھا۔ بلوغت کی سرحد سے بہت پہلے وہ زندگی کی گلیوں سے گزرتا ہوا، ماں کے سینے میں ایک ایسا زخم رکھ کر چلا گیا تھا جو دکھتے دکھتے بھی پورا محسوس نہ ہوتا تھا۔ بیماری مختصر تھی، صدمہ طویل۔ اس کی پیشانی کی حرارت، اس کی انگلیوں کی ڈھیلی پڑتی گرفت، اور پھر سفید چادر کے نیچے اس کے چہرے کی پراسرار خاموشی—یہ سب مناظر زہرہ کے باطن میں یوں ثبت ہو گئے تھے جیسے کسی نے آگ سے لفظ لکھ دیے ہوں۔

اس کے بعد کئی دن گزر گئے۔ دن یا رات، زہرہ کے لیے دونوں ایک جیسے تھے: جاگتی آنکھیں، خشک ہونٹ، دھڑکتا ہوا دل اور ذہن میں ایک ہی نام، ایک ہی صورت، ایک ہی پکار۔ نیند اس کی پلکوں سے ایسے روٹھ گئی تھی جیسے نیند بھی اس کے غم سے خوفزدہ ہو۔ لوگ تعزیت کے لیے آتے، صبر کی تلقین کرتے، جنت کی بات کرتے، اجر کی بات کرتے، مگر ماں کے کانوں تک الفاظ پہنچتے تو تھے، دل تک نہیں۔ وہ بس اپنے بیٹے کی وہ چھوٹی سی بنیان سینے سے لگا لیتی، کبھی اس کی کتاب کھول کر دیکھتی، کبھی بستے کی زپ کھولتی اور بند کرتی، کبھی اس کے تکیے پر چہرہ رکھ کر سسکتی رہتی۔

پھر ایک رات، جب آنسو شاید اتنے بہہ چکے تھے کہ بدن کی ساری توانائی تحلیل ہو گئی، زہرہ کو نیند آ گئی۔ یہ نیند بھی عام نہ تھی، جیسے کوئی غیبی دستِ شفقت اس کی پلکوں پر اتر آیا ہو۔ پہلے پہل اسے لگا کہ وہ ایک نہایت لطیف خوشبو میں ڈوبتی جا رہی ہے—ایسی خوشبو جو دنیا کے کسی پھول میں نہ تھی۔ پھر اس نے دیکھا کہ وہ ایک کشادہ، روشن اور شفاف وادی میں کھڑی ہے۔ وہاں روشنی تھی، مگر سورج نہ تھا؛ ہوا تھی، مگر اس میں گرد نہ تھی؛ رنگ تھے، مگر ان میں دنیا جیسی کثافت نہ تھی۔ ہر شے ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے نور نے شکل اختیار کر لی ہو۔

وہ حیران کھڑی تھی کہ دور سے ایک آواز آئی: “اماں"

یہ ایک لفظ نہ تھا، صدیوں کی پیاس پر برستی ہوئی بارش تھی۔ زہرہ نے چونک کر دیکھا—سامنے ایان تھا۔ بالکل ویسا ہی، مگر پھر بھی ویسا نہیں۔ وہی پیشانی، وہی آنکھیں، وہی ہلکی سی مسکراہٹ، مگر اب اس کے چہرے پر ایک ایسی طمانیت تھی جو زمین والوں کے نصیب میں کم آتی ہے۔ اس کے لباس میں سفیدی تھی، مگر وہ کپڑا نہیں، جیسے روشنی کا کوئی نرم پیرہن ہو۔ وہ دوڑ کر اس کے پاس گئی، اس کو سینے سے لگا لیا، اور ایسی روئی جیسے کسی نے اس کے وجود کی گرہ کھول دی ہو۔

“ایان! میرے بچے! تو کہاں چلا گیا تھا؟ مجھے کیوں چھوڑ گیا؟”

ایان نے اپنی ننھی مگر مطمئن ہتھیلیوں سے اس کے چہرے کو تھاما۔ “اماں، میں کھویا نہیں ہوں۔ میں تو یہاں ہوں... بہت اچھی جگہ ہوں۔ آپ کیوں اتنا روتی ہیں؟"

زہرہ نے بے یقینی سے گرد و پیش دیکھا۔ “یہ... یہ کہاں ہے؟"

وہ مسکرایا، اور اس کی مسکراہٹ میں کوئی پوشیدہ یقین چمکا۔ “یہ جنت کا ایک حصہ ہے، اماں۔ ہمیں یہاں رکھا گیا ہے۔ ہم سب وہ بچے ہیں جو بلوغت سے پہلے دنیا سے چلے گئے۔"

زہرہ کی نگاہیں پہلی بار پوری وادی میں پھیلیں۔ اب اسے محسوس ہوا کہ ایان کے ارد گرد صرف وہی نہیں، اور بھی بہت

سے بچے ہیں—کچھ لڑکے، کچھ لڑکیاں—مختلف عمروں کے، مگر سب کے چہروں پر عجب سکون تھا۔ کوئی پھولوں جیسے روشن میدان میں کھیل رہا تھا، کوئی کسی نورانی عمارت کی طرف جا رہا تھا، کوئی جھرنے کے کنارے بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا، کوئی شفاف ہواؤں میں بنتی بکھرتی تصویروں کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ ان سب میں معصومیت بھی تھی اور حیرت انگیز وقار بھی؛ جیسے بچپن کو یہاں ابدی تکریم مل گئی ہو۔

"یہ سب...؟" زہرہ نے پوچھا۔

"یہ سب وہ بچے ہیں جنہیں دنیا نے جلدی واپس بھیج دیا، یہ پیٹر، یہ مکیش، یہ سارہ۔۔۔ اس نے کئی نام بتائے، مختلف تہذیبوں، مختلف مذہبوں میں بچوں کے نام۔" ایان نے نرمی سے کہا، "مگر یہاں کوئی محرومی نہیں، کوئی اندھیرا نہیں، کوئی بخار نہیں، کوئی قبر کی تنگی نہیں جیسا آپ سوچتی رہی ہیں۔ یہاں رحمت بہت وسیع ہے۔"

زہرہ نے دھیان سے دیکھا تو واقعی بچوں کے احوال یکساں نہیں تھے۔ کچھ ایسے تھے جن کے ارد گرد نعمتوں کی فراوانی زیادہ تھی، ان کے چہروں پر سرشاری زیادہ روشن تھی، جیسے ان کی دنیا زیادہ آسودہ ہو۔ کچھ اور بھی خوش تھے، مگر ان کے مراتب میں فرق جھلکتا تھا۔ ماں کے دل میں سوال اٹھا: "میرے بچے، یہ فرق کیوں ہے؟"

ایان نے آسمان کی طرف نظر اٹھائی، جہاں نور کی تہیں جیسے دعا کی صورت بہہ رہی تھیں۔ "ہمیں بتایا گیا ہے کہ جن بچوں کے والدین دنیا میں جتنے زیادہ نیک تھے، تقویٰ اور اخلاص میں جتنے بلند تھے، ان کے بچے یہاں اتنی ہی زیادہ خوشحالی، آسودگی اور رفعت میں ہیں۔ والدین کے اعمال کا فیض یہاں تک پہنچتا ہے، اماں۔"

زہرہ کے دل پر یہ جملہ چوٹ کی طرح بھی لگا اور روشنی کی طرح بھی۔ اسے اپنے گریبان میں جھانکنے کا خیال آیا۔ کتنی نمازیں سستی سے ادا کی تھیں، کتنے غصے دل میں پالے تھے، کتنی غیبتوں پر خاموش رہی تھی، کتنی بار دنیا کی الجھنوں نے اسے ذکر سے دور کیا تھا۔ اسے پہلی بار محسوس ہوا کہ اولاد محض گھر کی زینت نہیں ہوتی، وہ والدین کے اعمال کے آئینے میں بھی پلتی ہے — یہاں تک کہ موت کے بعد کے جہان میں بھی۔

اس نے ایان کا ہاتھ تھام لیا۔ "اور تم؟ تم کیسے ہو؟"

"میں اچھا ہوں، اماں، بہت اچھا۔ آپ کے خیال سے بھی زیادہ۔"

اس کی آواز میں ایسا سچا اطمینان تھا کہ زہرہ کی آنکھیں پھر بھیگ گئیں، مگر اس بار ان آنسوؤں میں پہلی سی ٹوٹ پھوٹ نہ تھی۔ اس نے ارد گرد دیکھا تو کئی فرشتے نور کے میناروں کی مانند دور دور کھڑے تھے۔ ان کی موجودگی میں جلال بھی تھا اور انس بھی۔ کچھ بچے ان کے ساتھ جا رہے تھے، جیسے کسی درس گاہ کی طرف۔ کچھ نہایت باریک نقشوں، روشن تختیوں، اور متحرک شبیہوں کے سامنے مصروف تھے۔ زہرہ کو تعجب ہوا۔

"یہ سب کیا کر رہے ہیں؟"

ایان کے چہرے پر خوشی کی ہلکی سی لہر دوڑ گئی، جیسے اسے اپنی دنیا دکھانے کا اشتیاق ہو۔ "ہم یہاں صرف کھیلتے نہیں، سیکھتے بھی ہیں۔ ہر بچے کی ذہانت، فطانت اور ذہنی صلاحیت کے مطابق فرشتے اسے تعلیم دیتے ہیں۔ کسی کو حکمت سکھائی جاتی ہے، کسی کو حسنِ ترتیب، کسی کو تعمیر، کسی کو خدمت کے آداب، کسی کو علم کی باریکیاں، کسی کو نغمہ، کسی کو باغبانی، کسی کو نور سے اشکال بنانا، کسی کو ایسی صنعتیں جو دنیا میں لفظوں میں بھی بیان نہیں ہو سکتیں۔"

زہرہ کو یاد آیا، ایان دنیا میں بھی سوال بہت کرتا تھا۔ کبھی آسمان کیوں نیلا ہے، کبھی پرندے راستہ کیسے ڈھونڈتے ہیں، کبھی پانی کی بوند گرتی کیوں ہے۔ وہ اکثر تھک کر کہہ دیتی، "بس اب خاموش بھی ہو جاؤ!" اور وہ ہنس دیتا۔ آج وہی بچہ ایک غیر مرئی وقار کے ساتھ بات کر رہا تھا۔

"اور یہ جو تختیاں، یہ عمارتیں، یہ سارے کام؟"

"یہ ہمارے پراجیکٹس ہیں، اماں،" ایان نے ایک نورانی ہال کی طرف اشارہ کیا۔ "ہم مختلف کاموں پر لگے ہوئے ہیں۔ کچھ بچے جنت کے باغات کی ترتیب کے نئے نمونے بناتے ہیں؛ کچھ ایسے راستوں کی آرائش سیکھتے ہیں جن سے جنتی گزریں گے؛ کچھ چشموں اور نہروں کے کناروں کی خوب صورتی میں حصہ لیتے ہیں؛ کچھ استقبال کے آداب، کچھ مہمان نوازی کے فن، کچھ آرام گاہوں کی ترتیب، کچھ علم و حکمت کی مجلسوں کے اہتمام کا ہنر سیکھتے ہیں۔ یہاں جو کچھ ہے، اس میں خدمت بھی ہے، حسن بھی، علم بھی، اور خوشی بھی۔"

زہرہ نے حیرت سے کہا، "تم لوگ کام کرتے ہو؟"

وہ ہنسا، "یہ دنیا جیسا کام نہیں، اماں، جہاں تھکن ہوتی ہے، مجبوری ہوتی ہے، رزق کی فکر ہوتی ہے۔ یہاں سیکھنا بھی لطف ہے، کرنا بھی لطف ہے۔ ہر بچے کو اس کی صلاحیت اور پسند کے مطابق تربیت دی جاتی ہے۔ جب تربیت مکمل ہو جائے گی تو ہم اپنی مرضی اور پسند سے جنتیوں کی خدمت پر مامور ہوں گے۔ کوئی کسی کے لیے راحت کی چیزیں مہیا کرے گا، کوئی محفلوں کی آرائش، کوئی باغات کی نگرانی، کوئی نغمات کی ترتیب، کوئی نورانی سفروں کی رہنمائی۔ یہاں خدمت، عزت کی ایک صورت ہے، محرومی کی نہیں۔"

زہرہ نے سوچا، دنیا میں تو بچے بڑے ہو کر مستقبل کے لیے پڑھائے جاتے ہیں؛ یہاں بچے جنت کے لیے سنور رہے ہیں۔ دنیا میں تعلیم اکثر روزگار کے خوف سے جڑی ہوتی ہے؛ یہاں تعلیم محبت، خدمت اور تکمیلِ نعمت کا نام بن گئی تھی۔ اسے پہلی بار لگا کہ شاید خدا کے ہاں کسی معصوم کا چھن جانا محض اختتام نہیں، ایک غیر مرئی ابتدا بھی ہے۔

پھر ایان اسے ایک ایسے حصے میں لے گیا جہاں نہایت نرم روشنی کے گنبدوں کے نیچے بچے حلقوں میں بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے فرشتے تھے جو کچھ سکھا رہے تھے، مگر بغیر آواز کے۔ جیسے علم یہاں لفظوں سے زیادہ نور کے ذریعے منتقل ہوتا ہو۔ کہیں نقشے بن رہے تھے، کہیں شبیہیں ابھر رہی تھیں، کہیں ایک بچی اپنی ہتھیلیوں سے روشنی کے پھول بنا رہی تھی، کہیں ایک لڑکا کسی آبی گزرگاہ کی ساخت ترتیب دے رہا تھا۔ سب کے چہروں پر انہماک تھا، مگر سختی نہیں تھی؛ دھیان تھا، مگر بوجھ نہیں تھا۔

"یہ سب ایک دن جنتیوں کی مدد کریں گے؟" زہرہ نے آہستہ سے پوچھا۔ "تو کیا تم جنتیوں کے ملازم ہو گے؟"

زہرہ نے پہلی دفعہ فکرمندی سے پوچھا۔

"نہیں اماں، ملاز تو سارے فرشتے ہوں گے۔۔ ہم تو مددگار ہوں گے۔۔۔ کیا دن یا میں آپ کے حکم پر میں آپ کو پانی گلاس پلاتا تھا یا آپ کا کوئی کام کرتا تھا تو میں آپ کا ملازم ہوتا تھا؟"

زہرہ نے اسے زور سے سینے سے چمٹا لیا۔ پھر وہ سرگوشی کرتے ہوئے بولا:

"ہاں، اماں۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ جب قیامت برپا ہو گی، حساب ہو گا، اور لوگ اپنے اپنے انجام کو پہنچیں گے، تو جن بچوں کے والدین جنت کے حق دار ہو جائیں گے، وہ بچے اپنے والدین کے ساتھ رہیں گے۔"

یہ سنتے ہی زہرہ کا دل زور سے دھڑکا۔ "اپنے والدین کے ساتھ؟ یعنی... تم میرے ساتھ رہو گے؟"

ایان کی آنکھوں میں محبت اتر آئی۔ "اگر آپ جنت کی حق دار ہوئیں، تو ہاں، میں آپ کے ساتھ رہوں گا۔ ہمیں یہی بتایا گیا ہے۔ اسی لیے، اماں، آپ کو اب رونا کم اور اپنے اعمال کی فکر زیادہ کرنی چاہیے۔"

یہ جملہ ایان نے بچے کی طرح نہیں، کسی دانائی کے سفیر کی طرح کہا۔ زہرہ ساکت رہ گئی۔ اسے محسوس ہوا کہ یہ نصیحت نہیں چیلنج ہے۔۔۔ کتنی سیدھا مگر کتنا بھاری۔۔۔ وہ لرز گئی تھی۔ ماں ہونے کے باوجود یہاں وہ سوال کرنے والی تھی اور اس کا بچہ جواب دینے والا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہی، پھر اس کے دل میں ایک عجیب سوال اٹھا—ایک ایسا سوال جو ماں کی ممتا اور ابدیت کے تصور کے بیچ پیدا ہوتا ہے۔ اس نے ایان کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا، "میرے بچے... کیا تم جنت میں ہمیشہ بچے ہی رہو گے؟"

ایان کے ہونٹوں پر شوخی سے بھری مسکراہٹ آئی—وہی دنیا والی، مگر اب اس میں ایک لطیف رمز بھی شامل تھی۔ اس نے ذرا سا سر ٹیڑھا کیا اور بولا، "اماں، ساری باتیں ابھی جان لو گی؟"

زہرہ بے اختیار مسکرا دی، شاید کئی دنوں میں پہلی بار۔

ایان نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ "اچھے انسان بن کر رہنا، اللہ اور بندوں کا حق ادا کرنا۔ جنت میں ملیں گے تو یہ راز بھی کھل جائے گا۔"

یہ کہتے ہوئے اس کی آواز میں نہ وعظ کی سختی تھی، نہ فاصلوں کی سرد ی؛ وہ تو گویا محبت کا ایک عہد تھا، ایک ملاقات کا وعدہ۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے گرد کی روشنی بڑھنے لگی۔ دور سے دوسرے بچوں کی آوازیں آنے لگیں۔ جیسے کسی درس یا کسی اجتماع کا وقت ہو۔ ایان نے پلٹ کر ایک بار پھر ماں کو دیکھا—اس نظر میں الوداع بھی تھا، تسلی بھی، اور ایک خاموش تاکید بھی کہ اب دنیا میں واپسی کے بعد اس کے آنسو اپنی سمت بدلیں۔

زہرہ نے گھبرا کر اسے پکڑنا چاہا۔ "نہیں، مجھے چھوڑ کر مت جاؤ! مجھے بھی ساتھ لے چلو"

ایان نے سر نفی میں ہلایا۔ "ابھی نہیں، اماں۔ آپ کا کام ابھی باقی ہے۔"

"کیا کام؟" وہ بے بسی سے بولی۔

"صبر۔ عبادت۔ اپنے آپ کو پاک کرنا۔ اور میرا انتظار اس طرح کرنا کہ جب آئیں تو شرمندہ نہ ہوں۔"

پھر منظر دھندلانے لگا۔ روشنی دھوئیں کی طرح نہیں، دعا کی طرح بلند ہوئی۔ خوشبو مدھم ہونے لگی۔ بچوں کی آوازیں دور ہوئیں۔ ایان کی صورت ایک روشن نقطے میں ڈھلی اور پھر سب کچھ اوجھل ہو گیا۔

زہرہ کی آنکھ کھل گئی۔

فجر کی اذان ہو رہی تھی۔

کمرہ وہی تھا، دیواریں وہی، چھت وہی، تکیہ وہی—مگر وہ خود وہ نہ رہی تھی جو سونے سے پہلے تھی۔ اس کے گال آنسوؤں سے تر تھے، مگر یہ آنسو ویسے نہ تھے جیسے گزری راتوں کے تھے۔ ان میں صرف ہجر کا نمک نہ تھا، امید کی مٹھاس بھی گھلی ہوئی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے پہلی بار کئی دنوں بعد اپنے سینے میں ایک واضح سانس اترتی محسوس کی۔ دکھ موجود تھا، بلکہ پہلے سے زیادہ حقیقی تھا، مگر اب وہ اندھا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ایک رخ، ایک سمت، ایک مقصد جڑ گیا تھا۔

وہ اٹھی، وضو کیا۔ پانی جب چہرے پر پڑا تو لگا جیسے خواب کی باقی ماندہ روشنی جاگتی دنیا میں بھی اتر آئی ہو۔ جائے نماز بچھائی۔ تکبیر کہی۔ اور جب سجدے میں گئی تو اس کے لبوں سے صرف رونا نہ نکلا، ایک دعا بھی نکلی:

"اے میرے رب! اگر میرا بچہ تیرے پاس خیر و عافیت میں ہے تو مجھے بھی ایسا بنا دے کہ میں اس سے وہاں ملنے کے لائق ہو جاؤں۔ میرے صبر کو قبول کر، میری خطاؤں کو معاف کر، اور میرے بچے کو میرے لیے جدائی نہیں، ہدایت کا سبب بنا دے۔"

اس دن کے بعد گھر کی خاموشی تو کم نہ ہوئی، ایان کی کمی بھی پوری نہ ہوئی، اس کی کتابیں بھی وہی رہیں، بستر بھی ویسا ہی رہا؛ مگر زہرہ کے اندر ایک نئی شمع جل اٹھی۔ اب جب وہ بیٹے کی چیزیں دیکھتی تو صرف یہ نہیں سوچتی کہ وہ نہیں رہا، یہ بھی سوچتی کہ وہ کہیں ہے — ایک ایسی بستی میں جہاں معصومیت زوال نہیں پاتی، جہاں تعلیم نعمت ہے، خدمت شرف ہے، اور جہاں ایک دن ملاقات ممکن ہے، بشرطیکہ راستہ سیدھا رکھا جائے۔

لوگ کہتے تھے، "وقت مرہم رکھ دیتا ہے۔" مگر زہرہ جان گئی تھی کہ وقت نہیں، معنی مرہم رکھتے ہیں۔ اور اس کے غم کو اب ایک معنی مل گیا تھا۔

کبھی کبھی رات کو وہ پھر تکیے پر سر رکھتی، اور آہستہ سے کہتی، "ایان، میں کوشش کر رہی ہوں۔" پھر اس کے دل میں محسوس ہوتا، کہیں بہت دور، نور کے کسی باغ میں، ایک دس سالہ بچہ مسکرا کر کہہ رہا ہے:

"اماں، میں انتظار کر رہا ہوں۔"

نقطہ نظر

دانش علی
رابعہ جہانگیر

شادی: فلاح یا عدمِ تحفظ - ایک حقیقت

نقطہ نظر کے عنوان سے شائع ہونے والے مضامین ان کے مصنفین کی رائے پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اس سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ اس مضمون میں جدید ریاستی بندوبست کے بعد شادی کے ادارے کو عورت کی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے رکاوٹ قرار دیا گیا ہے۔ مضمون میں جو نقطہ نظر اختیار کیا گیا ہے، اس کے نتیجے میں شوہر خاندان کے ادارے کا سربراہ نہیں ہو سکتا۔ یوں لگتا ہے کہ شوہر اور بیوی کو یکساں اختیار دینے کو عورت کے لیے زیادہ بہتر قرار دیا گیا ہے۔ اس نقطہ نظر پر تنقید کرنے والے قارئین کے لیے یہ صفحات حاظر ہیں۔ (ایڈیٹر)

ہمارے معاشرے میں عمومی طور پر شادی کو عورت کے لیے ایک مضبوط سہارا سمجھا جاتا ہے۔ خاندان اکثر اسے "گھر کا بس جانا" کہہ کر ایک خوش آئند منزل کے طور پر پیش کرتا ہے، جبکہ معاشرہ اسے تحفظ اور استحکام کی علامت قرار دیتا ہے۔ بلاشبہ شادی ایک مقدس، فطری اور نہایت اہم ادارہ ہے جو مرد و عورت کے درمیان باہمی تکمیل، سکون اور سماجی ہم آہنگی کا ذریعہ بنتا ہے، اور کسی بھی مہذب معاشرے میں اس کی حیثیت بنیادی ہے۔ اس تناظر میں نہ مرد مکمل طور پر عورت سے بے نیاز ہے اور نہ عورت مرد سے، بلکہ دونوں ایک باوقار اور متوازن رشتے میں ایک دوسرے کے معاون ہیں۔

تاہم، جب اسی اہم اور مقدس ادارے کو اس حد تک مرکزی حیثیت دے دی جائے کہ اسے عورت کی فلاح، تحفظ اور بقا کا تقریباً واحد ذریعہ تصور کیا جانے لگے، تو اس سوچ میں ایک طرح کی یک رخی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں

غیر محسوس طور پر عورت کی شخصیت کے دیگر پہلو جیسے اس کی خود مختاری، صلاحیتیں اور انفرادی شناخت پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔ یوں آہستہ آہستہ یہ تاثر اجتماعی شعور کا حصہ بن جاتا ہے کہ گویا عورت کی فلاح، عزت اور استحکام کا بنیادی راستہ صرف شادی ہی ہے۔

اسلام، بلاشبہ، شادی کو ایک بابرکت، فطری اور باوقار ادارہ قرار دیتا ہے۔ قرآن مجید اسے سکونِ قلب، مودّت اور رحمت کا ذریعہ قرار دیتے ہوئے فرماتا ہے:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ۔

ترجمہ: اور یہ بھی اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمہاری ہی جنس سے تمہارے لیے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو، اور اس نے تمہارے درمیان محبت اور رحمت رکھ دی۔ یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں۔ (سورۂ روم: 21)

لیکن اصل سوال یہ نہیں کہ شادی اہم ہے یا نہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب شادی کو عورت کے لیے واحد ذریعۂ بقا بنا دیا جائے تو کیا وہ قرآن کے بیان کردہ مقصد پر قائم رہتی ہے، یا آہستہ آہستہ ایک سماجی مجبوری، نفسیاتی دباؤ اور غیر مرئی قید کی صورت اختیار کر لیتی ہے؟

شادی بطور متبادلِ فلاح

پاکستان جیسے معاشروں میں، جہاں ریاستی فلاح اور سماجی تحفظ کے ادارے کمزور ہیں، شادی سے وہ توقعات وابستہ کر لی جاتی ہیں جو دراصل ریاست اور سماج پر عائد ہوتی ہیں۔ عورت کی رہائش، معاش، صحت اور حتیٰ کہ اس کی سماجی شناخت تک ایک ہی رشتے کے حوالے کر دی جاتی ہے۔ گویا اگر رشتہ محفوظ ہے تو عورت محفوظ ہے، اور اگر رشتہ ٹوٹ جائے تو اس کی زندگی بھی غیر محفوظ ہو جاتی ہے۔

یہاں ایک خاموش مفروضہ کارفرما ہوتا ہے کہ مرد اپنی ذات میں ایک فلاحی نظام ہے اور شادی گویا ایک سوشل سکیورٹی اسکیم۔ اس تصور میں عورت کے لیے کسی ریاستی سہولت، سماجی تحفظ یا مضبوط قانونی ڈھانچے کی ضرورت محسوس ہی نہیں کی جاتی، کیونکہ اس کا مستقبل پہلے ہی ایک فرد کے ساتھ وابستہ کر دیا جاتا ہے۔

حالانکہ اسلامی تصورِ فلاح محض خاندانی انتظام تک محدود نہیں بلکہ ایک وسیع اجتماعی اخلاقی نظام ہے۔ زکوٰۃ، صدقات، بیت المال، یتیموں اور مسکینوں کی کفالت جیسے ادارے اس بات کی دلیل ہیں کہ اسلام میں فلاح انفرادی نہیں بلکہ مشترکہ ذمہ داری ہے۔ ایسے میں شادی کو فلاح کا متبادل بنا دینا دراصل دین کی تعلیم نہیں بلکہ ہماری سماجی کمزوریوں اور ریاستی ناکامیوں کا اظہار ہے۔

معاشی انحصار اور طاقت کا عدم توازن

نکاح کے ساتھ ذمہ داریاں لازم ہوتی ہیں۔ شوہر پر نان و نفقہ فرض کیا گیا ہے، مگر اسی کے ساتھ قرآن مجید عورت کے ساتھ حسنِ سلوک، مشاورت اور انصاف کا بھی تقاضا کرتا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اسلام رشتے کو محض مالی بندوبست نہیں بلکہ ایک اخلاقی شراکت سمجھتا ہے۔

لیکن جب عورت کی پوری معاشی زندگی شادی سے وابستہ ہو جائے تو رشتے میں طاقت کا توازن بگڑنے لگتا ہے۔ فیصلہ سازی، صحت، تعلیم، بچوں کی پرورش اور حتیٰ کہ اپنی ذات سے متعلق بنیادی معاملات میں بھی اس کی آواز کمزور پڑ جاتی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ ایک شریک کے بجائے ایک تابع فریق میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

یہ صورتحال اسلامی عدل کے اس تصور سے متصادم ہے جس میں ہر انسان، خواہ مرد ہو یا عورت، بذاتِ خود ایک مکمل اخلاقی وجود رکھتا ہے جس کی عزت، رائے اور وقار بذاتِ خود قابلِ احترام ہیں۔

انفرادی ذمہ داری اور شادی کا اخلاقی مفہوم

اگر شادی کو اجتماعی ناکامیوں کا متبادل بنا دیا جائے تو فرد کی اخلاقی ذمہ داری بھی دھندلا جاتی ہے۔ حالانکہ اسلام ہر انسان کو اپنے اعمال اور فیصلوں کا خود ذمہ دار قرار دیتا ہے۔

شادی دو آزاد، باشعور اور ذمہ دار انسانوں کے درمیان ایک اخلاقی معاہدہ ہے۔ یہ کسی ایک کی ملکیت اور دوسرے کی مجبوری نہیں بلکہ ایک ایسی شراکت ہے جس میں دونوں فریق اپنی مرضی، شعور اور اختیار کے ساتھ شامل ہوتے ہیں۔ اسی لیے شادی کو ایسی بیساکھی بنا دینا جو انسان کو خود مختاری کے بجائے محتاجی کی طرف لے جائے، اسلامی تصورِ انسان کے ساتھ ہم آہنگ نہیں۔

عزت اور صبر: مفہوم کی لغزش

ہمارے معاشرے میں عزت اور صبر جیسے بلند اخلاقی تصورات کو اکثر عورت کی خاموشی اور برداشت کے جواز کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے، حالانکہ قرآن مجید انصاف پر قائم رہنے کا حکم دیتا ہے، چاہے اس کی قیمت خود اپنے خلاف ہی کیوں نہ ادا کرنی پڑے۔

اسلام میں صبر ظلم کو قبول کرنے کا نام نہیں بلکہ ناانصافی کے مقابلے میں وقار، شعور اور حکمت کے ساتھ کھڑے رہنے کا نام ہے۔ اس لیے کسی نقصان دہ یا غیر محفوظ شادی کو محض سماجی عزت کے نام پر جاری رکھنا دراصل صبر کی روح کو مسخ کرنا ہے۔

جب شادی سہارا نہ بن سکے

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہر شادی محفوظ نہیں ہوتی۔ طلاق، بیوگی، علیحدگی یا گھریلو تشدد جیسے حالات میں اگر عورت کے پاس کوئی قانونی یا سماجی سہارا نہ ہو تو اس کی کمزوری پوری شدت سے سامنے آ جاتی ہے۔ ایسے میں وہ صرف ایک رشتہ ہی نہیں کھوتی بلکہ اکثر اپنی سماجی حیثیت، معاشی تحفظ اور نفسیاتی وقار بھی کھو بیٹھتی ہے۔

قرآن مجید عورتوں کو نقصان پہنچانے، دباؤ میں رکھنے اور اذیت دینے سے واضح طور پر منع کرتا ہے۔ اس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اسلام شادی کو قید نہیں بلکہ انسانیت، تحفظ اور وقار کا ذریعہ بنانا چاہتا ہے۔

شادی سے آگے تحفظ کا تصور

اگر عورت کی فلاح کو صرف شادی سے مشروط کر دیا جائے تو عدمِ تحفظ معاشرے کا مستقل حصہ بن جاتا ہے۔ اسلامی تصور اس سے کہیں زیادہ وسیع اور متوازن ہے۔ تعلیم، صحت، قانونی تحفظ، معاشی خود کفالت اور سماجی احترام — یہ سب عورت کے تحفظ کے بنیادی ستون ہیں۔

اسلام رشتوں کو جوڑنے کا درس دیتا ہے، مگر ظلم سہنے کا نہیں۔ وہ تعلق نبھانے کی ترغیب دیتا ہے، مگر عزتِ نفس کو مٹانے کی نہیں۔

نتیجہ: شادی تقریب نہیں، ایک ذمہ داری

ہمارے معاشرے میں شادی کو اکثر ایک خوشی کی تقریب اور سماجی روایت کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ رسومات اور

نقطہ نظر

تقریبات اس قدر نمایاں ہو جاتی ہیں کہ اصل حقیقت پس منظر میں چلی جاتی ہے۔ حالانکہ شادی کسی تقریب کا نام نہیں بلکہ ایک سنجیدہ ذمہ داری ہے۔

یہ دراصل دو انسانوں کے درمیان ایک شراکت ہے، جس میں اعتماد، احترام اور ذمہ داری بنیادی ستون ہوتے ہیں۔ اس شراکت کو کامیاب بنانا دونوں فریقوں کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔

اسی لیے ضروری ہے کہ معاشرے میں یہ شعور عام کیا جائے کہ شادی صرف ایک رسم نہیں بلکہ زندگی کا ایک سنجیدہ مرحلہ ہے۔ والدین کو چاہیے کہ وہ اپنے بیٹوں اور بیٹیوں دونوں کی تربیت اس انداز سے کریں کہ وہ اس ذمہ داری کو سمجھ سکیں۔

تعلیم اور تربیت دونوں اس عمل میں بنیادی کردار ادا کرتی ہیں۔ نوجوانوں کو شادی سے پہلے عملی ذمہ داریوں سے گزارا جانا چاہیے — چاہے وہ ملازمت ہو، کاروبار ہو یا کسی اور نوعیت کی ذمہ داری — تاکہ وہ ذمہ داری اٹھانے کی اصل حقیقت کو سمجھ سکیں۔

جب شادی شعور، ذمہ داری اور باہمی احترام کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے تو وہ صرف دو افراد کو نہیں بلکہ پورے معاشرے کو استحکام عطا کرتی ہے۔

نصرت بھٹو

چھوٹے چھوٹے خداؤں کے نام

یہ تحریر اُن لوگوں کے نام ہے جو بڑے عہدوں پر نہیں
ہوتے، مگر بڑی انا کے تخت پر بیٹھے ہوتے ہیں

وہ کسی ملک کے صدر نہیں ہوتے، مگر اپنے چھوٹے سے دائرے میں خود کو سلطنت کا مالک سمجھتے ہیں۔ کوئی ادارے کا سربراہ، کوئی اسکول کا پرنسپل، کوئی گھر کا قوام، کوئی محلے کا منتظم مگر مزاج ایسا جیسے سچ اور جھوٹ کا فیصلہ صرف انہی کے ہاتھ میں ہو۔

یہ وہ لوگ ہیں جو حق کو پہچانتے بھی ہیں، مگر ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ کیونکہ حق کو تسلیم کرنا انا کے تاج کو ہلکا کر دیتا ہے،

اور انہیں تاج عزیز ہوتا ہے... سچ نہیں۔ یہ باطل کے نعرے کو اتنی بلند آواز میں دہراتے ہیں کہ سچ کی دھیمی مگر سچی صدا دب جائے۔

یہ دلیل سے بات نہیں کرتے، یہ عہدے سے بولتے ہیں۔ یہ انصاف نہیں کرتے، یہ اختیار کے زور پر فیصلے سناتے ہیں۔ سرِعام جھوٹ بولتے ہیں مگر چہرے پر دیانت کا نقاب سجائے رکھتے ہیں۔ الفاظ میں اخلاقیات، مگر کردار میں تکبر، سختی اور بے رحمی۔

یہ ظاہری اقدار کی چادر اوڑھ لیتے ہیں تاکہ اندر کی تاریکی چھپ جائے جیسے اندھیرا روشنی کا لباس پہن لے۔

انہیں اختلاف سے خوف آتا ہے، کیونکہ اختلاف ایک آئینہ ہوتا ہے۔ اور آئینے میں وہ سچ دکھائی دیتا ہے جس سے وہ برسوں سے نظریں چرا رہے ہوتے ہیں۔

تاثرات

یہ چھوٹے چھوٹے حکمران اپنے گرد چاپلوسوں کی دیوار کھڑی کر لیتے ہیں۔ سچ بولنے والے انہیں باغی لگتے ہیں، سوال کرنے والے گستاخ اور انصاف مانگنے والے مسئلہ۔ کیونکہ انہیں نظام نہیں، اپنی حکمرانی عزیز ہوتی ہے۔

وہ سمجھتے ہیں کہ اختیار ہمیشہ رہے گا، کہ کرسی کبھی خالی نہیں ہو گی، کہ لوگ ہمیشہ خاموش رہیں گے۔

مگر تاریخ کا ایک اٹل اصول ہے:

جھوٹ جتنا بھی اونچا کھڑا ہو، اس کی بنیاد ہمیشہ ریت پر ہوتی ہے۔ وقت گواہی دیتا ہے کہ اقتدار کا شور آخر کار خاموشی میں بدل جاتا ہے، اور یاد وہی لوگ رکھے جاتے ہیں۔

جنہوں نے سچ کا ساتھ دیا نہ کہ وہ جنہوں نے سچ کو دبایا۔ اے چھوٹے چھوٹے ٹرمپوں اور یاہوؤں، یاد رکھو:

اختیار آزمائش ہے، ملکیت نہیں۔ عہدہ ذمہ داری ہے، برتری نہیں۔

اور سچ۔۔۔۔۔

سچ کو نہ تمہارے دستخط کی ضرورت ہے نہ تمہاری اجازت کی۔ ایک دن تمہارے فیصلے نہیں، تمہارا کردار تمہارا تعارف ہو گا۔

اور اس دن نہ عہدہ بولے گا نہ طاقت

صرف سچ بولے گا۔

علامتی سکیچ (تحریر کے خیال کی بصری جھلک)

کلام: حمیرا رحمان

غزل

تعارف

حمیرا رحمان 24 نومبر 1957 کو پاکستان میں پیدا ہوئیں۔ انہوں نے اپنے پیشہ ورانہ سفر کا آغاز ریڈیو پاکستان، ملتان سے کیا اور بعد ازاں لندن میں بی بی سی سے وابستہ رہیں۔ وہ اس وقت نیویارک یونیورسٹی میں غیر ملکی طلبہ کو اردو زبان کی تدریس سے وابستہ ہیں اور امریکہ میں مقیم پاکستانی کمیونٹی کی ایک فعال رکن کے طور پر بھی خدمات انجام دے رہی ہیں۔ حمیرا رحمان ایک ممتاز شاعرہ بھی ہیں جن کی شاعری میں ہجرت، شناخت اور احساسِ تنہائی جیسے موضوعات نمایاں ہیں۔ ان کے شعری مجموعوں میں "تشنگی"، "ایک ساخواب"، "اک شام میرے نام"، "نام"، "چاند کے ساحل پر" اور "سرخ گلابوں کا گم" شامل ہیں، جو ان کی فکری گہرائی اور تخلیقی قوت کا مظہر ہے۔ پچھلے دنوں انھوں نے غامدی سنٹر ڈیلس میں منعقد ہونے والی ادبی محفل میں بطور خاص شرکت کی۔ اپنا کلام بھی سنایا۔ اس میں یہ غزل بھی شامل تھی۔ "صالحات" کے قارئین کے لیے اسے یہاں شائع کیا جا رہا ہے۔ ان کا انٹرویو دیکھنے کے لیے لنک ملاحظہ فرمائیں:

https://youtu.be/i3f2NC6rnYg?si=5Um8ZYKZvJBKIdAX

عجیب الجھی ہوئی داستاں کا حصہ ہیں
وہاں کے ہیں ہی نہیں ہم جہاں کا حصہ ہیں

گزرتے رہتے ہیں ہر روز رائیگانی سے
ہم ایسے شعبدہ گاہِ سیاہ کا حصہ ہیں

سمجھ رہے ہیں کہ ہم ہیں مگر کہیں بھی نہیں
یقین کے شور میں وہم و گماں کا حصہ ہیں

ادھار مانگی ہے کچھ سال زندگی ہم نے
زمین پہ رہتے ہوئے آسماں کا حصہ ہیں

جو تیز دھوپ میں ہیں سوچ بھی نہیں سکتے
وہ غائبانہ کسی سائبان کا حصہ ہیں

زمین بانٹی تو آنے لگے ہیں راستے میں
وہ چند بوڑھے شجر جو مکاں کا حصہ ہیں

یہ عمر ایسے تضادات میں گزاری ہے
منکرین میں ہیں اور ہاں کا حصہ ہیں

حمیرہ نیند نہ آنے سے آنکھ کھلنے تک
یہ خواب کیفیت درمیاں کا حصہ ہیں

ڈاکٹر عرفان شہزاد

"خدا بول رہا ہے"

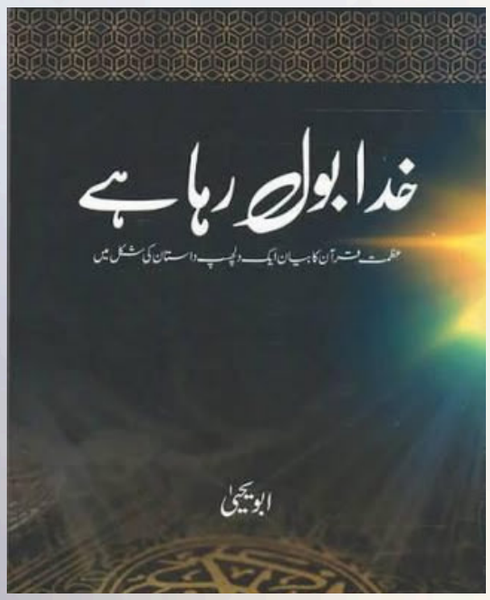

ناول نگار: ابو یحییٰ

صفحات: ۲۴۳

قیمت: ۳۰۰

تبصرہ نگار: ڈاکٹر عرفان شہزاد

ہمارے محترم جناب ابو یحییٰ ریحان احمد یوسفی کا نیا ناول "خدا بول رہا ہے" پڑھنے بیٹھا تو ایک حیرت، ایک بے خودی کی کیفیت میں پڑھتا ہی چلا گیا۔ معلوم تب ہوا جب ناول ختم ہو گیا۔ دیکھا تو میری آنکھیں اشک بار تھیں۔ سچ کہوں، آنکھیں اشک بار نہیں تھیں، میں اندر سے بہت رو رہا تھا، دل پگھل کر حلق میں آ پھنسا تھا۔ خدا سے مل کر آدمی روئے نا، یہ تو نہیں ہو سکتا، اور یہ ملنا بھی تو بہت دن بعد جو ہوا تھا۔

غفلت کی کتنی تہیں ہیں، جو ہمارے اور خدا کے درمیان حجاب بن گئی ہیں۔ ان تہوں کو اتارنے کے لیے جو قرآن اتارا گیا تھا، اس کو بھی ہم نے کبھی غلاف کی تہوں میں تو کبھی منطق و فلسفہ، تصوف و کلام، روایات و خرافات اور مسلک اور

تعصب کی تہوں میں گم کر دیا ہے۔ یہ ناول ان حجابوں کو ایک ایک کر کے اتارتا ہے اور ہمیں قرآن کی آواز بے غبار کر کے سناتا ہے کہ:

"لوگو اللہ کی عبادت کرو، جس نے تمھیں پیدا کیا۔ تم ایک روز اس کے حضور لوٹ کر پیش ہو گے۔ وہاں تمھارے ہر عمل کا حساب ہو گا۔ جس نے خدا کی عبادت، بندوں کی خدمت اور سچائی پر خود کو قائم رکھا اور دوسروں کو بھی اس پر ثابت قدم رہنے کی تلقین کی، وہی نجات پائے گا۔ باقی لوگ جہنم کے کوڑے خانے میں ہمیشہ کے لیے بلکتے سسکتے چھوڑ دیے جائیں گے۔" (صفحہ 197)

میں عموماً اصلاحی قسم کے ناول پڑھنے کے لیے مائل نہیں ہو پاتا۔ اس میں ادب ایک طرف رہ جاتا ہے اور پند و نصیحت غالب آ جاتی ہے۔ مگر یہ ناول کچھ اور چیز ہے۔ عجب دردِ دل اور بصیرت سے لکھا ہوا ہے کہ غفلت ہو یا تنقیدی اپچ، ہر رکاوٹ کو عبور کر کے قاری کے دل پر جا دستک دیتا ہے۔ ایسی صدا لگاتا ہے کہ کوئی اہل دل اس سے کان بند نہیں کر سکتا۔ اس ناول کو پڑھنے میں گزرا وقت، زندگی کا قیمتی ترین سرمایہ ہے:

دل کے لیے ہزار سود ایک نظر کا زیاں

یہ ناول، ''جب زندگی شروع ہو گی'' سے شروع ہونے والی داستان کی چوتھی قسط ہے۔ اس داستان کا آغاز دنیا میں حق و باطل کی کش مکش اور آزمایش کی خدائی اسکیم کی داستان سے شروع ہو کر موت کے بعد میدانِ حشر کی منزل، اور اس کے آگے، اس ناول میں، جنت میں داخلے اور اس کے برتنے تک پہنچ کر یہ داستان اختتام پذیر ہوتی ہے۔ اس ساری داستان میں قرآن کے پیغام کو بار بار واضح کیا گیا ہے کہ وہ انسان کو موت کے بعد کی ہمیشہ کی زندگی کی کامیابی کے لیے اس دنیا میں ایمان و عمل کا مطلوبہ معیار اختیار کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس داستان کے اگلے حصوں، یعنی ''قسم اس وقت کی'' اور ''آخری جنگ'' میں بہت سے عقلی، اخلاقی و شرعی مسائل مثلاً الحاد، لاادریت، صبر و شکر کی حقیقت، فقہی تفصیلات اور پیچیدگیوں سے ہٹ کر نکاح و طلاق کا شرعی طریقہ، گھریلو ناچاقی وغیرہ کو بھی قرآن کی روشنی میں داستان کی شکل میں بڑی عمدگی سے سمجھایا گیا ہے۔

موجودہ ناول ''خدا بول رہا ہے'' میں خدا سے روٹھے ایک عام مسلمان کی خدا کی طرف پلٹنے کی داستان بیان ہوئی ہے، جو ہمارے آج کے سماج کا بہت بڑا مسئلہ ہے، مگر اس کا ادراک نہایت ہی کم لوگوں کو ہے اور اس کا علاج تو اس سے بھی کم کو معلوم ہے۔ یہ ناول اس درد کا درمان کرتا ہے۔

مصنف نے قرآن کے پیغام کو کیسی سادہ بیانی سے بیان کیا ہے ملاحظہ کیجیے: ”اگر آپ اجازت دیں تو کیا میں یہ سوال کر سکتا ہوں کہ کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ جنت میں جائیں گی؟ (صفحہ 145)“

بعض جملے تو آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں:

"خدا نے دنیا انسانوں کے امتحان کے لیے بنائی تھی، مگر انسان پچھلی دنیا میں بیشتر وقت خدا کا امتحان لیتے رہے۔ اللہ میاں یہ کر دیں اللہ میاں وہ کر دیں۔ کر دیں گے تو ٹھیک ہے ورنہ ہم نے نہ آپ کو ماننا ہے اور نہ آپ کی بات کو ماننا ہے۔ (صفحہ 75)“

”ایک لڑکی کو مرد سے دو طرح کا تحفظ چاہیے ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ اس مرد کے ساتھ ہونے پر خود کو دوسرے مردوں کے شر سے محفوظ سمجھے۔ دوسرے یہ کہ خود اس مرد کے شر سے بھی محفوظ رہے۔“(۲۰۳)

مصنف ایک جگہ بہت خوب صورت مثال سے سمجھاتا ہے کہ کس طرح قرآن کی اہمیت کم کی گئی۔ کہانی کا کردار ایک لکیر کھینچتا ہے اور کہتا ہے کہ اسے چھوئے بغیر چھوٹا کر کے دکھاؤ۔ مخاطب کہتا ہے کہ یہ ناممکن ہے۔ کردار اس کے ساتھ مزید اس سے بڑی لکیریں لگا کر دکھاتا ہے کہ دیکھو اب یہ لکیر دوسری لکیروں سے چھوٹی نظر آنے لگی۔ قرآن کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔ اس کو چھوٹا نہیں کیا گیا۔ مگر اس کے ساتھ دوسری چیزوں کو عملی طور پر اس سے بڑا اور اہم مان لیا گیا اور قرآن کی اہمیت ختم ہوتی چلی گئی۔

ایک جگہ مصنف کی غیرتِ قرآن کچھ اس طرح جوش کھاتی نمودار ہوتی ہے:

"حقیقت یہ تھی کہ مذہب کے نام پر دنیا میں جو کچھ بھی پایا جاتا ہے اس میں کوئی چیز قرآن کے مقابلے کی نہیں۔ کون سی چیز ہے جس کی حفاظت کا وعدہ اللہ نے کر رکھا ہے۔ کون سی چیز ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ باطل اس کے آگے سے آ سکتا ہے نہ پیچھے سے۔ کون سی چیز ہے جسے انسانیت اور اہل ایمان کے لیے ہدایت کہا گیا ہے۔ کون سی چیز ہے جسے دوسری مذہبی چیزوں کو تولنے کا میزان یعنی ترازو اور ان کو پرکھنے کی کسوٹی کہا گیا ہے۔ کون سی چیز ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس کے کلام الٰہی ہونے میں کوئی شک نہیں۔ کون سی چیز ہے جس کے متعلق آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی شکل میں خدا بول رہا ہے۔ کوئی ہے؟ کوئی نہیں۔"(صفحہ 140)“

اس ناول میں مصنف نے انسانی جذبات اور نفسیات کے بارے میں اپنے گہرے مشاہدے کا ثبوت بھی دیا ہے، جس سے ناول کی کہانی ہمارے اور قریب آ جاتی ہے، مثلاً کہانی کی ایک کردار، اسریٰ احمد کے بارے میں لکھا ہے:

"اسریٰ ہر وقت مردوں کے بیچ میں رہتی تھی۔ وہ اندر سے مردوں سے خوفزدہ تھی، اپنے خوف کو چھپانے کے لیے وہ بظاہر بہت سخت بن چکی تھی مگر اس سختی کو خود پر طاری رکھنے کی وجہ سے وہ کچھ تھک جاتی تھی۔"(صفحہ 136

اسریٰ جب وقار سے شادی کا فیصلہ کر لیتی ہے تو اس کے اظہار کے لیے وہ فائل پر اپنے نام کے آگے لکھا اپنا خاندانی نام کاٹ کر کہانی کے ہیرو کا نام لکھ لیتی ہے۔ یہ ہمارے معاشرتی پسِ منظر میں عورت کی نفسیات کا دل چسپ بیان ہے۔ اسی طرح دفاتر میں کولیگز کی آپسی گپ شپ حقیقت سے بہت قریب ہے۔ انسان کا ضمیر کس طرح دیر سے اثر پذیر ہوتا ہے، معاشی عدم تحفظ کا شکار نوجوان، جمال، اس کی مثال ہے۔ ضمیر بیدار ہونے کے باوجود بھی وہ معاش کے خوف سے مکمل خلاصی نہیں حاصل کر پاتا۔ اسی طرح بوڑھی والدہ کی ممتا بھری جذباتی بلیک میلنگ بھی خوب صورتی سے بیان کی گئی ہے۔ حتیٰ کہ برتن دھونے کی جو تفصیل اور اس سے اخذ کردہ نتائج، مصنف کے مشاہدے یا تجربے یا دونوں پر دلالت کرتی ہے۔

بعض جگہ مصنف نے لطیف حسِ مزاح کا ذائقہ بھی چکھایا ہے اور بعض جگہ جذبات و احساسات کو مؤثر مگر سادہ استعاراتی زبان میں بیان کیا ہے۔ شادی کا پروپوزل ملنے پر کہانی کے دو مرکزی کرداروں کی گفتگو دیکھیے:

”اسریٰ! آپ قرض ادا کرتے کرتے سود ادا کرنے پر آ گئی ہیں۔ سود کھانا ہمارے مذہب میں حرام ہے۔ میں یہ سود نہیں کھا سکتا۔“

یہ سود نہیں ہے انویسٹمنٹ ہے۔ میں بزنس وومن ہوں۔ خسارے کا سودا نہیں کرتی۔"(صفحہ 213)“

جنت اور اس کے مناظر کی منظر کشی اگرچہ کسی انسان کے تخیل کے بس کی چیز نہیں، مگر اس میں بھی مصنف نے وہ کیفیت پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ قاری خود کو جنت کے ماحول میں کرداروں کے ساتھ چلتا پھرتا اور ان کی گفتگو سنتا محسوس کرتا ہے۔

اس ناول کو پڑھنا ایک دریافت ہے: خدا کی دریافت، قرآن کی دریافت اور خود اپنی اور اپنے مقصدِ حیات کی دریافت۔ مصنف نے دل جلا کر سرِ عام رکھ دیا ہے، اب جس کے جی میں آئے وہ پائے روشنی۔

ہر دردمند دِل کو رونا مرا رُلا دے
بے ہوش جو پڑے ہیں، شاید اُنھیں جگا دے

عائشہ کلیم

ڈرامہ پامال-ایک تنقیدی جائزہ

ڈائریکٹر: خضر ادریس

مصنفہ: زنجبیل عاصم شاہ

فنکار: صبا قمر، عثمان مختار، حارث وحید

پروڈکشن: ملٹی ورکس انٹرٹینمنٹ

نشریاتی چینل: گرین انٹرٹینمنٹ

ڈرامہ پامال ناظرین میں بے حد مقبول ہوا، کیونکہ یہ ہمارے معاشرے کے کئی اہم پہلوؤں کی نشاندہی کرتا ہے اور ہمیں اپنے رویّوں پر غور و فکر کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں بہتر بنانے کا پیغام بھی دیتا ہے۔ اس ڈرامے میں شادی شدہ زندگی کے نشیب و فراز کو نہایت خوبصورتی اور حساس انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ متوسط اور امیر طبقوں کے احساسات، جذبات، معاشی حالات اور خاندانی رشتوں کے درمیان پیدا ہونے والے تناؤ اور ہم آہنگی کو بھی ہلکے مگر مؤثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

یہ ڈرامہ غیر شادی شدہ اور شادی شدہ جوڑوں کے حوالے سے کئی اہم سوالات اٹھاتا ہے۔ مثال کے طور پر کیا گھر میں ہر وقت لڑکی کے سامنے صرف اس کی شادی کا ذکر کرتے رہنا مناسب ہے؟ کیا آنے والے رشتوں کے بارے میں

شادی سے پہلے اچھی طرح تحقیق اور چھان بین ضروری نہیں؟ کیا لڑکے کے اپنے والدین اور گھر والوں کے ساتھ رویّے کو جانچنا اہم نہیں؟ جوانی میں بیوہ ہو جانے والی خواتین کو سماجی طور پر محدود کیوں کر دیا جاتا ہے؟ بیوہ خواتین کو اپنی زندگی اور اپنی اولاد کے مستقبل کے بارے میں خود مختار فیصلے کرنے کا حق کیوں نہیں دیا جاتا؟

ڈرامہ پامال کی کہانی ایک متوسط گھرانے کی لڑکی ملائکہ کے گرد گھومتی ہے۔ ملائکہ ایک بااعتماد، باصلاحیت، بااخلاق اور خوبصورت لڑکی ہے جو اپنے خاندان کی بہت عزت کرتی ہے اور ان سے گہری محبت رکھتی ہے۔ وہ اپنی ماں سے بھی بے حد محبت کرتی ہے، جو جوانی میں بیوہ ہو چکی ہوتی ہے، اور ملائکہ اپنی ماں کے لیے ہمیشہ فکر مند رہتی ہے۔

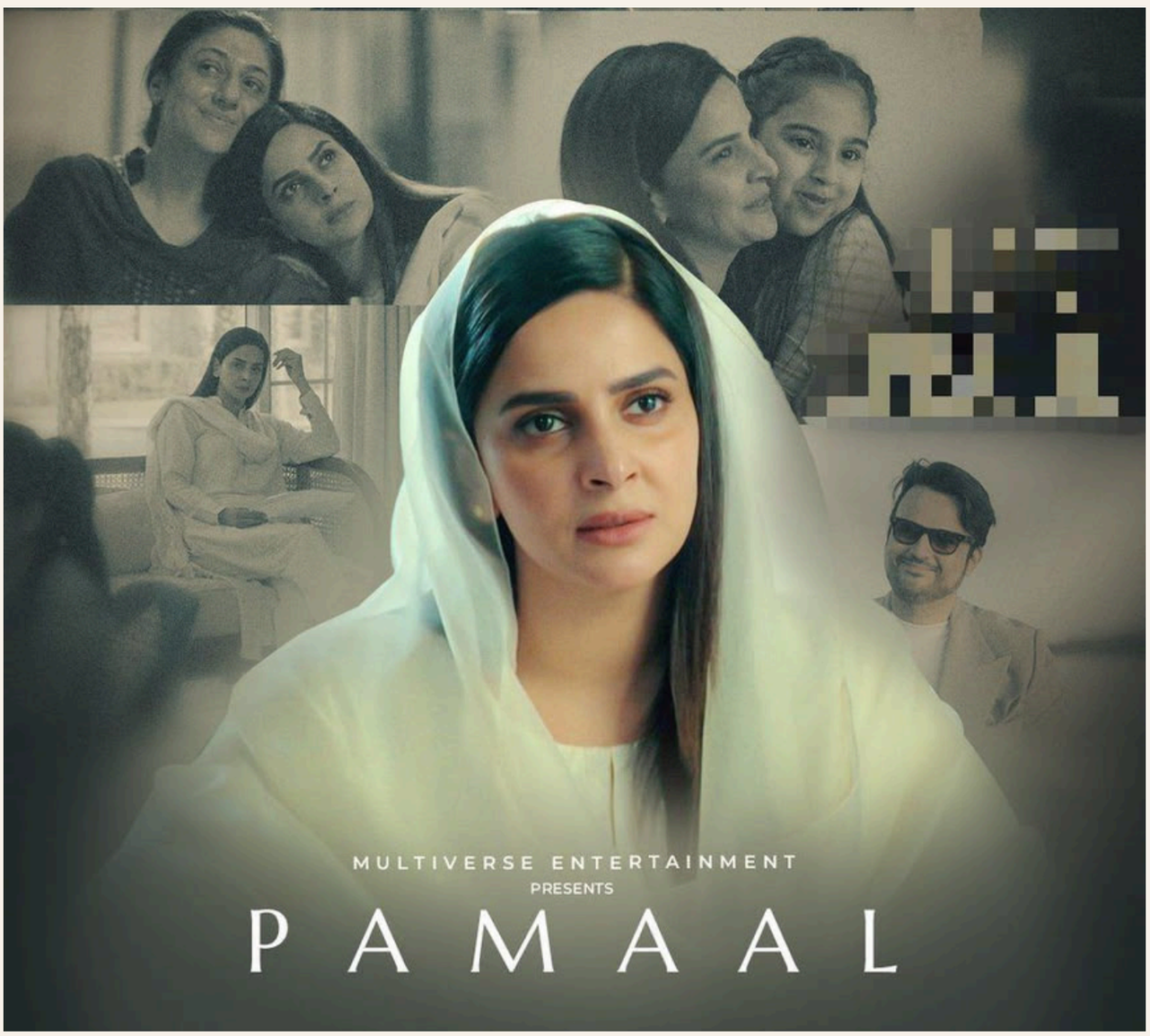

ملائکہ کی والدہ کو اس کی شادی کی مسلسل فکر رہتی ہے، مگر ملائکہ اپنے ہونے والے شوہر کے بارے میں ایک منفرد اور سنجیدہ رائے رکھتی ہے۔ اسی وجہ سے وہ اپنے ماموں زاد بھائی کا رشتہ بھی مسترد کر دیتی ہے، جو اس کی خود اعتمادی اور مضبوط شخصیت کی عکاسی کرتا ہے۔

مصنفہ نے اس ڈرامے کے ذریعے آج کی نوجوان لڑکیوں کو ایک اہم پیغام دینے کی کوشش کی ہے کہ شادی میں آئیڈیل ازم بہت خطرناک رجحان ہے۔ اسے زندگی کا واحد مقصد سمجھنا مناسب نہیں۔ بعض لڑکیاں ایک مثالی اور تصوراتی شریکِ حیات کی تلاش میں اپنی زندگی کے اہم سال انتظار میں گزار دیتی ہیں، جو بعد ازاں مایوسی اور دل شکستگی کا باعث بن سکتا ہے۔ اس پہلو کو ڈرامے میں نہایت حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

یہ ڈرامہ اس طرف بھی توجہ دلاتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں شادی اور رشتوں کے معاملات میں بہت سی باتیں قسمت اور نصیب پر چھوڑ دی جاتی ہیں۔ اکثر کہا جاتا ہے کہ "قسمت میں ہو گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا" یا "لڑکے یا لڑکی کی قسمت خراب ہے"، حالانکہ حقیقت میں درست فیصلہ سازی، تحقیق اور باہمی سمجھ بوجھ کی بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔

ڈرامے میں ایک اہم مسئلہ یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ ظلم سہنا اور اس کے خلاف آواز نہ اٹھانا دراصل ایک نفسیاتی بوجھ بن جاتا ہے، جو عورت کی شخصیت کو متاثر کرتا ہے اور اسے اندرونی انتشار کا شکار بنا دیتا ہے۔ ملائکہ کی والدہ کا اسے ہمیشہ صبر اور برداشت کا مشورہ دینا بظاہر درست محسوس ہوتا ہے، مگر اس کے منفی اثرات بھی سامنے آتے ہیں۔

ملائکہ کے شوہر رضا کی شخصیت پر بھی کئی سوالات اٹھتے ہیں۔ وہ ایک تعلیم یافتہ اور خوشحال گھرانے سے تعلق رکھنے کے باوجود احساسِ کمتری، شک اور عدمِ تحفظ کا شکار نظر آتا ہے۔ اس کردار کے ذریعے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا شادی کے لیے صرف مالی حیثیت، اعلیٰ خاندانی پس منظر اور ظاہری شان و شوکت ہی کافی ہیں؟ اکثر لوگ خوبصورتی اور معاشی آسودگی کو ہی سب کچھ کیوں سمجھ لیتے ہیں؟

رضا کا بار بار اپنی بیوی کی تذلیل کرنا اور بعد میں معافی مانگ لینا ایک ایسا رویّہ ہے جو ہمارے معاشرے میں عام دیکھا جاتا ہے۔ ملائکہ ہر بار اسے معاف کر دیتی ہے، جس سے رضا یہ سمجھ لیتا ہے کہ اس کا رویّہ قابلِ قبول ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بعض مرد اپنی غلطیوں پر سنجیدگی سے غور کیوں نہیں کرتے اور اپنے رویّے کو بہتر بنانے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟ تحفوں کے ذریعے تعلق کو بہتر بنانے کی کوشش کرنے کے بجائے کیا بہتر نہیں کہ میاں بیوی ایک دوسرے کے ساتھ کھل کر بات کریں، ایک دوسرے کی رائے کا احترام کریں اور باہمی اعتماد کو مضبوط بنائیں؟

کیا عورت کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنی رائے دے، اپنے شوق پورے کرے اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے؟ ایک صحت مند ازدواجی تعلق میں شوہر کا اپنی بیوی کی حوصلہ افزائی کرنا اور اس کی ترقی میں مدد دینا بے حد اہم ہوتا ہے۔

ڈرامے کے آخر میں ملائکہ اپنے شوہر کی وفات کے بعد خود کو سنبھالنے اور اپنی پامال شدہ شخصیت کو دوبارہ تعمیر کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ وہ ایک مضبوط ماں کے طور پر ابھرتی ہے اور اپنی بیٹی کے روشن مستقبل کے لیے درست اور پُراعتماد فیصلے کرتی ہے۔

وفات سے پہلے رضا کا ملائکہ سے یہ کہنا کہ

"اب تم وہ بنو اور وہ کرو جو تم شادی سے پہلے کرنا چاہتی تھیں"

اس بات کی علامت ہے کہ ملائکہ کے صبر، حوصلے اور ثابت قدمی نے بالآخر یہ ثابت کر دیا کہ اس کا مؤقف درست تھا۔

آخر کار ملائکہ اپنے دیرینہ خواب کو پورا کرتے ہوئے ایک مصنفہ بن جاتی ہے اور خود کو ایک باوقار، خود مختار اور مضبوط شخصیت کے طور پر منوا لیتی ہے۔